میرے سفر بھی کیا سفر؟

مولانا عبدالعلی فاروقی

مولانا عبدالعلی فاروقی کی چند مفید و دل چسپ اور قابل مطالعہ کتابیں

یادوں کے جھروکوں سے

شخصیات اور واقعات سے وابستہ مصنف کی یادوں کا دل چسپ مرقع۔ چھوٹے چھوٹے مضامین میں بڑی بڑی لائق عبرت و نصیحت باتیں۔ کم و بیش پچاس سالہ تجربات زندگی کا بیان مکالماتی زبان اور پر بہار و پر اثر ادبی اور سلیس انداز نگارش میں

قیمت =/250 ₹

میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے

ملک کی نام ور، کم نام، اور ان ہی کے ساتھ گم نام مگر لائق تقلید ہستیوں کے سلسلہ میں تاثراتی تحریریں، جن سے ان شخصیات کے فضل و کمال اور ان کی مثالی خوبیوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ مصنف کے اساتذہ، آباء صالحین اور اکابر ملت کے ساتھ ساتھ "حلقۂ یاراں" کی ان شخصیات کا ذکر جمیل جنہیں پڑھتے اور مطالعہ کرتے ہوئے ہر قاری انہیں اپنے سے قریب محسوس کرے گا۔ اس فانی دنیا سے رخصت ہونے والے باکمالوں کا تذکرہ، پر درد و پر سوز ادبی و علمی اسلوب نگارش میں ———

قیمت =/200 ₹

اسلام ہمارا مذہب ——— اور ہم مسلمان

مسلم پرسنل لا، تین طلاقوں کا مسئلہ، مدارس دینیہ میں عصری و سائنسی تعلیم، رمضان اور عید، بابری مسجد کا عدالتی فیصلہ؟۔ پوسٹ مارٹم، ویلنٹائن ڈے، بیوہ کی ستی، جیسے مذہبی اور سماجی مسائل پر ۳۲ رعنوانوں کے ساتھ عصری اسلوب، سہل اور سادہ انداز بیان میں لکھے جانے والے مضامین کا مجموعہ

قیمت =/150 ₹

ہمارے اسلاف

سادہ اور آسان اردو زبان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر اور زبانی یاد کئے جانے والی سیرت مبارکہ کے ساتھ ساتھ ۳۰ رجلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مختصر اور مستند سوانحی خاکہ۔ کئی مدارس کے نصاب تعلیم میں شامل۔ مصنف کی اولین مطبوعہ کتاب

قیمت =/40 ₹

میرے سفر بھی کیا سفر؟

کم و بیش پچاس سالہ اسفار میں سے مصنف کے چند منتخب اسفار کی دل چسپ روداد سفر۔ ملکی و غیر ملکی اسفار کے تجربات کے ساتھ ہی مقامات سفر اور ذرائع سفر کی ضروری تفصیلات کا بیان۔ زندہ و دل نشین انداز نگارش میں ——— سفرناموں پر مشتمل ایک نئی و منفرد کتاب

قیمت =/200 ₹

اکثر یاد آتے ہیں (زیر طبع)

ماضی قریب میں دنیا سے رخصت ہونے والی چند ممتاز شخصیات کی یاد میں مصنف کے اشک ہائے عقیدت و محبت میں ڈوبی ہوئی تحریریں، یادوں کے ایسے چراغ جو ہر صاحب فکر و نظر کو روشنی کا سامان فراہم کریں۔ درد و سوز میں ڈوبے ہوئے اسلوب نگارش میں ان بجھے چراغوں کا تذکرہ جو بجھ کر بھی اپنی خوشبو سے قلب و نظر کو معطر و منور کرتے ہیں۔ خوبصورت کمپیوٹر کتابت، اعلیٰ طباعت، جاذب نظر سرورق۔ مجلد

قیمت =/225 ₹

ملنے کا پتہ:

مکتبہ البدر کاکوری، لکھنؤ - ۲۲۶۱۰۱
MAKTABA AL-BADR
KAKORI, LUCKNOW-226101 (U.P.) INDIA

السفر وسيلة الظفر

(سفر کامیابی کا ذریعہ ہے)

میرے سفر بھی کیا سفر؟

کم و بیش نصف صدی پر محیط اسفار، اور سفری تجربات کی یادرہ جانے والی کچھ تفصیلات کا بیان! اس امید کے ساتھ کہ دوسرے ان تجربات سے نفع اٹھاسکیں گے......؟؟

از قلم

مولانا عبدالعلی فاروقی

(فاضل دیوبند-ایم،اے[اردو]،ایم-اے[عربی])

ناشر

مکتبہ البدر، کاکوری، لکھنؤ-۲۲۶۱۰۱

MAKTABA AL-BADR

KAKORI, LUKCNOW-226101 (INDIA)

اشاعت اول .... اگست ۲۰۲۱ء

نام کتاب .... میرے سفر بھی کیا سفر؟

نام مصنف .... مولانا عبدالعلی فاروقی

(فاضل دیوبند،ایم-اے اردو،ایم-اے عربی)

E-mail:aafarooqi4@yahoo.com

Mobile No. 9415775044

کمپوزنگ .... عبدالقدوس ندوی

صفحات .... ۱۶۰(مجلد)

تعداد ۵۰۰

مطبع .... نعمانی پریس، لکھنؤ

قیمت .... =/200 ₹ (دوسو روپے)

مکتبہ البدر کاکوری، لکھنؤ— ۲۲۶۱۰۱ (انڈیا)

MAKTABA AL-BADR

KAKORI, LUKCNOW-226101 (INDIA)

مکتبہ ایوب کاکوری، لکھنؤ، انڈیا

MAKTABA AIYOOB

KAKORI, LUKCNOW-226101 (INDIA)

الفرقان بک ڈپو، نظیرآباد، لکھنؤ— (انڈیا)

ALFURQAAN BOOK DIPOT

31, Nayagaon (West) Nazirabad,Lucknow-226018 (INDIA)

فہرست

انتساب

دنیا کی تاریخ کے سب سے مبارک اور
سب سے کامیاب مسافروں
یعنی
اپنے تن، من، دھن کی بازی لگا کر اور اپنے وطن کو ایک عظیم مقصد کی خاطر تج کر، ہجرت مدینہ کا سفر کرنے والے یاران وفا پیشہ اور ان کے سالار کارواں پیکر اخلاص و مروت، محسن انسانیت، رہبر راہِ نجاتِ آدمیت، خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام!
اس التجا کے ساتھ کہ

اپنا ہی سا اے نرگس مستانہ بنادے
میں جب تجھے جانوں، مجھے دیوانہ بنا دے
اک برقِ ادا خرمن ہستی پہ گرا کر
نظروں کو مری طور کا افسانہ بنادے
.... دیوانہ بنادے، مجھے دیوانہ بنادے

خاک پائے مہاجرین مدینہ
عبدالعلی فاروقی
ابراہیم منزل، پاٹا نالہ، لکھنؤ

انعام خداوندی

یقیناً یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے کہ اس نے کم وبیش پچاس سالہ اسفار کے دوران ہر قسم کی دست یاب سواری سے سفر کرایا۔

بیل گاڑی اور سائیکل کے کیریئر، نیز کشتی و بوٹ سے لے کر کاروں، بسوں، ریلوں، اور جہازوں تک سفر کرنے کے مواقع ملے۔ ایک مرتبہ تو والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے طفیل میں ہاتھی کی سواری کا بھی موقع ملا۔

پھر سیکڑوں کلومیٹر کے سفر ریل کے جنرل کلاس سے لے کر اے-سی کے ہر درجہ میں سفر کرنے کے حق تعالیٰ نے اپنے کرم سے مواقع عطا کئے۔

ظاہر ہے کہ سب کے تجربات الگ الگ ہیں ....؟؟

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں!

تقریظ

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب مدظلہ العالی
مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ (یوپی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عالم آفرینش کی ابتداء ایک سفر سے ہوئی، جس کا تعلق آدم علیہ السلام کی حیات مبارکہ سے جوڑنا مناسب ہوگا، اس سفر کا تعلق عالم کون ومکاں سے عالم انسانیت کی طرف روانہ ہونے سے ہے، اور یہ سب واقعات اللہ تبارک تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق پیش آئے۔

میرے خیال میں یہ پہلا انسانی سفر تھا، جو اللہ تعالی کے حکم سے عالم انسانی کو آباد کرنے اور اعمال کی جزاء وسزاء کی تعیین کے لئے انسانی تاریخ کا بنیادی پتھر تھا۔

اس کے بعد سے رحلات واسفار کا سلسلہ برابر جاری ہے، اس موضوع پر پورا کتب خانہ موجود ہے، اور اس میں برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے، میرے رفیق سفر حضرت مولانا عبدالعلی فاروقی صاحب ایک عظیم علمی ودینی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں، انھوں نے اپنی پوری زندگی کو داستان اسفار بنادی، جو نصف صدی پر محیط ہے، سب سے اہم حرمین شریفین کا سفر ہے، پھر جنوبی ہند کا سفر اور اسکے ساتھ اس وسیع اور شاداب ملک کے مختلف شہروں کا سفر جس میں گل زاروں کی

وادی (غالباً خطۂ کشمیر) کا سفر، اور اس ملک کے مشہور اور وسعت پذیر شہر ممبئی اور اس کے مضافات کا سفر، پھر ملک کے مشرقی حصے کا سب سے بڑا اور مشہور کلکتہ کا سفر، یہ سارے اسفار اندرون ہند کے مشہور اور یادگار شہروں اور اس کے ساتھ ہی بیرون ہند امارات، قطر کے سفر کی داستان نہایت خوشگوار ہے۔

پھر دیگر قابل ذکر اسفار کے ساتھ، مختلف عنوانات کے ذیل میں مزید اسفار کا ذکر بھی قابل استفادہ ہے، ان یادگار سفروں کے مختلف عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ایک سفر اپنوں کے لئے (۲) ایک مبارک سفر
(۳) سفر اندر سفر (۴) ایک درپیش سفر

عنوانات مذکورہ سے یقین ہے کہ یہ اسفار بھی نہایت اہمیت کے حامل ہیں، اور ان اسفار کی مختصر روداد بھی ہمارے لئے باعث درس اور تاریخ اسفار میں ایک اہم داستان سفر کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس عالم اسفار کے وسیع تر کتب خانے کی ایک پاکیزہ کڑی ہے۔

میں اس کتاب کے مصنف حضرت مولانا عبدالعلی فاروقی صاحب، فاضل دیوبند، اور عربی واردو میں ایم اے کا درجہ عالیہ حاصل کرنے والے عالم دین، اور اس عظیم خاندان کے فرد عزیز کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کے قلم کے اس ادبی شہ پارے کو اہل علم کی خدمت میں پیش کر کے دلی مسرت محسوس کررہا ہوں۔

اللہ تعالی ہر طرح مبارک فرمائیں۔ (آمین)

راقم
سعید الرحمٰن الاعظمی
مدیر ''البعث الاسلامی''
ندوۃ العلماء، لکھنؤ
۲۰۲۱/۷/۴ء

دل کی بات

سفر وسیلۂ کامیابی بھی ہے اور تمام قسم کی سہولیات میسر ہونے کے باوجود پُر ابتلا و پُر خطر بھی ہے۔ اپنے گھر میں چاہے وہ ایک چھوٹی سی کٹیا ہی ہو، جو بے فکری اور سکون قلبی میسر ہوتا ہے، کسی درپیش سفر کا تصور آتے ہی وہی کیفیت ہوتی ہے جو ایک پرسکون دریا کی اس میں ڈھیلا پھینکے جانے سے ہوجاتی ہے۔

مسافر کتنا ہی معزز و مکرم ہو، بہ ہر حال دوسروں کے رحم و کرم پر منحصر ہونے کی وجہ سے اپنی مرضی کا مالک نہیں ہوتا ہے —— اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حفیظ میرٹھی مرحوم کے الفاظ میں وہ یوں گہار لگاتا ہے کہ ؎

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

اور کبھی مسلسل ''عالم مسافرت'' کی تلخیوں سے اکتا کر اپنی ''بے بسی'' کا وہ یوں اظہار کرتا ہے کہ ؎

مسافر کے رستے بدلتے رہے
مقدر میں چلنا تھا چلتے رہے

سفر کی حصول یابیوں میں راحت کے دوش بدوش کلفت، عزت و حرمت کے ساتھ ہی ساتھ قدم قدم پر ٹھوکریں اور ان سے سنبھلنے کی ذمہ داری، اور حالت سفر میں بھی اپنی ''حیثیت عرفی'' کے تحفظ کے لئے جدوجہد شامل ہونے کی وجہ سے سفر کو ایک ایسی ''تجربہ گاہ'' بنا دیتی ہیں جن کا سفر کے بغیر تصور بھی

نہیں کیا جاسکتا ہے؟۔

مسافر کسی بھی حیثیت اور سماجی مرتبہ کا حامل ہو، اسے سفری تجربے ضرور ہوتے ہیں۔ اور تجربوں کو تقسیم کر کے وہ ایک ایسی ذہنی و قلبی مسرت سے ہم کنار ہوتا ہے، جیسی مسرت ایک سر پر بوجھ ڈھونے والے کو اپنی منزل پر پہنچ کر سر کا بوجھ اتارنے سے حاصل ہوتی ہے۔

سفری تجربوں کی اس تقسیم سے دوسروں کا بھی بہت بھلا ہوتا ہے، سفر کا ارادہ رکھنے والوں کو سامان سفر کرنے میں مدد ملتی ہے، اور باذوق لوگ تجربہ کار مسافر کے تصوراتی ہم سفر بن کر گھر بیٹھے ہی سیر و سیاحت کا لطف اٹھا لیتے ہیں —— یہ الگ بات ہے کہ نہ ہر مسافر اپنے تجربات سفر کو دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت وقدرت رکھتا ہے، نہ ہی اس کے لئے وہ عزم وارادہ رکھتا ہے؟۔

میرے خیال میں صدیاں گذر جانے کے باوجود ابن بطوطا کا نام دنیا کی معلوم تاریخ کے سب سے بڑے سیاح ہونے کی حیثیت سے آج تک زبانوں پر اس لئے نہیں ہے کہ انہوں نے آج جیسی سفری سہولیات نہ ہونے کے باوجود ''زمینی سیاحت'' کا ایک ریکارڈ بنایا —— بلکہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اپنے ''سفری تجربات'' کو اس اہتمام کے ساتھ تقسیم کیا کہ آج تک انہیں مزے لے لے کر پڑھا بھی جا رہا ہے، ان سے نفع بھی اٹھایا جا رہا ہے، اور ان سے ترغیب پا کر دوسروں کو بھی اپنے سفری تجربات تقسیم کرنے کی توفیق ملی، اور مل رہی ہے؟۔

دور حاضر کے ایسے باتوفیق لوگوں میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ کا نام سب سے نمایاں ہے، جنہوں نے اپنے متعدد سفرناموں میں اپنے مخصوص دل کش و شیریں انداز بیان میں اپنے سفری تجربات کو تقسیم کر کے ہزارہا ہزار ارباب ذوق کے لئے ذخیرۂ معلومات کے ساتھ ہی سامان فرحت ونشاط بھی فراہم کیا۔

ملک سے لے کر بیرون ملک تک مختلف مقاصد کو لے کر سفر راقم الحروف نے بھی کیئے، اور ظاہر بات ہے کہ ہر مسافر کی طرح اسے بھی ''سفری تجربات'' حاصل ہوئے۔ جن میں سے کچھ یاد رہ جانے والے قابل ذکر تجربوں کو اپنی کتاب ''یادوں کے جھروکوں سے'' میں شامل بھی کیا—— تاہم اس کا تو کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ اس کی بھی نوبت آئے گی کہ میں اپنے اسفار کی روداد مرتب کر کے اپنے ''سفری تجربات'' کو دوسروں میں تقسیم کروں گا؟۔ اور اب جب کہ متعدد محرکات وترغیبات کے زیر اثر یہ کام ہو ہی گیا ہے۔ اور میرے کچھ اسفار کی رودادوں پر مشتمل ایک کتاب کی اشاعت ہونے جارہی ہے، تو میں اس تردد و کشمکش میں مبتلا ہوں کہ اس کتاب سے پڑھنے والوں کا کچھ ''بھلا'' بھی ہو سکے گا؟۔ اور انہیں اپنے نفع کی کوئی بات مل بھی سکے گی یا پھر میری تصانیف کی فہرست میں ایک اس کتاب کا بھی اضافہ ہی ہو کر رہ جائے گا—— اور بس؟۔ یہی وجہ ہے کہ ''اپنی حیثیت'' کے ساتھ ساتھ ''اپنی دلی کیفیت'' کے اظہار کے لئے میں نے اپنی اس کتاب کا نام ''میرے سفر بھی کیا سفر؟'' تجویز کیا ہے، کہ اگر اس کتاب میں شامل کوئی رودادِ سفر، اس کی کوئی بات۔ کسی کے لئے، کسی بھی درجہ میں مفید و نفع بخش بن گئی تو سبحان اللہ!۔ اور ایسا کچھ نہ ہو سکا تو کم سے کم یہ الزام تو نہیں لگ سکے گا کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

جہاں تک اسفار کی رودادوں کو بالارادہ مرتب کر کے ان کی کتابی صورت میں اشاعت کو ''سعی لاحاصل'' قرار دیئے جانے کی بات ہے۔ تو اسے میں اپنے اوپر ہونے والا ایک ظلم قرار دینے پر مجبور ہوں گا—— کیوں کہ میں نے جب بہ کثرت سفر کیئے، تو فطری طور پر ان میں سے کچھ سفر تو ایسے ضرور ہوں گے جو ایک مسافر کی حیثیت سے خود میری اپنی نظر میں کسی خاص پس منظر کی وجہ

سے اہمیت کے حامل ہوں گے۔ اور ان کی روداد مرتب کر کے ''اپنے سفری تجربات'' کو دوسروں میں تقسیم کرنے کا مجھے حق حاصل ہوگا؟—— پھر اس کے بعد کار آمد و مفید، یا لغویات کا مجموعہ وغیر مفید قرار دینے کا تعلق قارئین کے اپنے ذوق و معیار سے ہوگا، جس کی نہ تعیین و تحدید کی جاسکتی ہے، نہ ہر ایک کے ذوق کی رعایت ہی ممکن ہے؟۔

کیا اس ذوق، وجدان، یا احساس کو کسی قانون کے ذریعہ پابند سلاسل کیا جاسکتا ہے کہ ؎

جو ہوا ذنِ اہل گلشن تو میں ہر کلی سے کہہ دوں
ترا مضمحل تبسم مرے ذوق پر گراں ہے

آپ اپنے ذوق کی رعایت کرتے ہوئے دوسرے کے ذوق سے اختلاف تو کر سکتے ہیں، لیکن کسی دوسرے کے ذوق کو اپنے ذوق کا پابند نہیں بنا سکتے ہیں؟۔

مندرجہ بالا معروضات کی روشنی میں میری اپنے قارئین سے یہی درخواست ہے کہ میرے منتخب اسفار پر مشتمل اس کتاب کا ''میری حیثیت'' کا تصور کیئے بغیر مطالعہ کیجئے۔ مجھے امید ہے کہ کہیں پر کوئی بات تو آپ کو اچھی اور اپنے ذوق سے ہم آہنگ مل ہی جائے گی—— کیوں کہ میرا معاملہ یہ ہے کہ ؎

ٹکڑے لئے بیٹھا ہوں یوں شیشۂ دل کے
جیسے کہ مسیحا کا پتہ بھول گیا ہوں

آگے حد ادب!—— فقط

عبدالعلی فاروقی

۲۱/ جون ۲۰۲۱ء مطابق ۹/ ذیقعدہ ۱۴۴۲ھ روز دوشنبہ

حرمین شریفین کا سفر

رب جلیل کے اس انعام کا شکر ادا کرنے سے زبان وقلم عاجز ہیں کہ اس نے حرمین شریفین کی حاضری کے لئے پہلے سفر حج کی سعادت بھرپور جوانی کی عمر میں عطا کر کے ان مقامات مقدسہ سے وابستہ سارے ارمان پورے کرنے کا موقع فراہم کیا —— یہ جوانی ہی کی برکت تھی کہ حجر اسود کو منھ لگا کر چومنے کا ارمان بھی نکلا، اور ۵-۵، ۶-۶ گھنٹے مختلف صفوں میں گذار کر حرمین کی صف اول میں اور پیش امام کے پیچھے با جماعت نمازیں ادا کر لینے کا شوق بھی پورا ہوا، ''حطیم'' میں نمازیں پڑھنے اور ''ملتزم'' سے لپٹ چمٹ کر اپنے رب سے بھیک مانگنے کا موقع بھی ملا، اور ''مقام ابراہیم'' پر صلوٰۃ الطواف ادا کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوگئی۔ اور در رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہو کر رشید کوثر فاروقی کا یہ ''تصوراتی نغمہ'' سنانے کا بھی موقع مل گیا کہ ؎

حبذا چشم تصور یہ کہاں لے پہنچی
میزباں احمد مختار ہیں مہماں ہوں میں
استراحت گہِ صدیقؓ و عمرؓ ہے چپ وراست
درمیانِ وزرائے شہ ذیشاں ہوں میں

اور پھر یہ ''باجواب'' فریاد بھی کہ ؎

میں کروں عرض کہ اندھیر ہے نگری نگری
آپ ارشاد کریں نیز فاراں ہوں میں

میں کروں عرض کہ ہوں درد سراپا میں حضور
آپ ارشاد کریں درد کا درماں ہوں میں
میں عرض کروں کہ پرساں نہیں کوئی میرا
آپ ارشاد کریں کہ میں ترا پرساں ہوں میں
بارك اللّٰہ لك سیدی أنظر حالی
کہ زباں گنگ ہے، نادم ہوں پشیماں ہوں میں
سلّم اللّٰہ علی روحك اسمع قولی
عملاً ہیچ ہوں، قولاً تو مسلماں ہوں میں
انما انت حبیبی و قریبی کوثرؔ
تو جو مسلم ہو، تو مسلم کا نگہباں ہوں میں

یہ بھی میری خوش بختی کہ میری فرمائش پر علامہ رشید کوثر فاروقی مرحوم نے بھٹکل سے یہ نظم بہ عنوان ''زیارت حرمین تصور میں'' کچھ ہی عرصہ پہلے ''البدر'' میں اشاعت کے لئے خصوصی طور پر بھیجی تھی، اور اس وقت اپنی مؤثر منظر کشی اور باسلیقہ اظہار جذبات کی وجہ سے قریب قریب یہ پوری ہی طویل نظم مجھے زبانی یاد ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے اپنے بے قرار جذبوں کو منظوم طور پر شفیع محشر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش کرنے کی بھی سعادت حاصل ہوگئی تھی۔

رشید کوثر فاروقی مرحوم کے سلسلہ میں یہ مختصر وضاحت مناسب ہے کہ وہ ایک بہت اچھے اسلامی اسکالر اور قادر الکلام شاعر تھے، لیکن انہیں ان کے شایان شان شہرت نہیں مل سکی۔ بلکہ ان کے مقابلہ میں ان کے چھوٹے بھائی تسنیم فاروقی مرحوم کو ان کے بہاریہ اور مذہبی کلام خصوصاً مدح صحابہؓ پر مشتمل کلام کی وجہ سے زیادہ شہرت واعزاز ملا۔ اپنے دور جوانی میں وہ مشاعروں میں شریک ہو کر اپنی مترنم آواز میں اپنا پر مغز واثر انگیز کلام پیش کرتے تو بسا اوقات پورے پورے مشاعرے لوٹ لیا کرتے تھے۔ بہ طور استشہاد ان کے چند اشعار درج

ذیل ہیں ۔

شعر کہتی ہیں مری تنہائیاں
گنگناتی ہیں تیری پرچھائیاں
رات میرے ساتھ ان کو دیکھ کر
دیر تک روٹھی رہیں تنہائیاں
آپ، اور ہم دونوں پیچھے رہ گئے
فاصلے طے کرگئیں رسوائیاں

اور برسوں پہلے ایک مشاعرہ میں ان کی زبانی سنے ہوئے ان کے اس شعر نے تو دھوم مچادی تھی، اوراتنی مرتبہ ان سے یہ شعر پڑھوایا گیا تھا کہ مجبور ہوکر ان کو کہنا پڑ گیا تھا کہ آگے بھی کچھ سن لیجئے۔ اچھے شعراور بھی ہیں۔ مطلع کا شعر یہ تھا ۔

ہر شاخ گلستاں پر لکھی یہ عبارت ہے
نیلام ہے پھولوں کا خوشبو کی تجارت ہے

جب کہ بڑے بھائی رشید کوثر فاروقی کی شاعری چھوٹے بھائی سے کسی طرح کم نہ تھی، مگر اس کے کم شہرت پانے کی غالبًا ایک وجہ یہ بھی رہی کہ تسنیم صاحب کی پوری عمر لکھنؤ میں ہی گذری اور یہاں کی ادبی محفلوں ومشاعروں میں ان کی بھر پور شرکت رہی۔ لیکن رشید کوثر صاحب کی عمر کا بڑا حصہ اپنے وطن بسواں ضلع سیتا پور اور لکھنؤ سے بہت دور بھٹکل میں گذرا، جہاں وہ انجمن ڈگری کالج میں غالبًا انگریزی کے لیکچرار تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ وطن واپس آئے لیکن جلد ہی اس دارفانی سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پڑھنے پڑھانے اور لٹریری ذوق کی وجہ سے وہ اپنی شاعری پر خاطر خواہ توجہ نہ کرسکے۔ نہ انہیں اپنے کلام کی طباعت واشاعت سے دلچسپی رہی، نہ ہی وہ مشاعروں کے شاعر تھے۔ مجھ سے اور میرے بڑوں سے دونوں بھائیوں

کو اللہ واسطے کی محبت تھی۔ جس کا فائدہ اٹھا کر ہی میں نے ''البدر'' میں اشاعت کے لئے ان کے کلام کی فرمائش کی تھی جس کے جواب میں انہوں اپنی معرکہ آرا نظم بہ عنوان ''زیارت حرمین تصور میں'' ارسال کی تھی۔ جس کا آغاز اس طرح ہوا تھا۔

دل ہے غمگیں کبھی افتاں کبھی خیزاں ہوں میں
اے صبا راہ لگ اپنی کہ پریشاں ہوں میں
کیا کہا تو نے، کہ میں جاتی ہوں سوئے حرمین
اے صبا، جا، ترے صدقے ترے قرباں ہوں میں

۱۹۷۷ء میری زندگی میں کئی خوشیاں لے کر آیا، اسی سنہ کے پانچویں مہینے مئی میں مجھے اللہ تعالیٰ نے پہلی بیٹی عطا کی، جس کا نام والد ماجدؒ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اہلیہ کے نام پر ام رومان رکھا، اور یہ بیٹی ہمارے لئے بہ فضل خداوندی اسم بامسمّٰی ثابت ہوئی اور اب ماشاءاللہ تین بیٹوں کی ماں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو شریفانہ اخلاق اور اعمال صالحہ کے ساتھ عمر دراز کرے۔ آمین۔ پھر اسی مہینے کے اختتام پر میرے عزیز ترین رسالہ ''البدر'' کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا، جسے حق تعالیٰ نے عوامی قبولیت بھی عطا کی اور اس کے ذریعہ دینی واصلاحی خصوصاً اصلاح عقائد سے متعلق بڑی خدمت لی۔ اور پھر اسی سنہ کے ماہ اکتوبر میں پہلی مرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت حرمین شریفین ومقامات مقدسہ کا شرف حاصل ہوا۔ فلہ الحمد و الشکر۔

حج کا یہ سفر سعادت حق تعالیٰ کے کرم خاص کے بعد میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا مرہون منت ہے، جس کے لئے انہوں نے میرے اشتیاق فراواں کو دیکھتے ہوئے (جس کا کچھ حال میرے اس خط سے معلوم ہوگا جو میں نے اپنے احباب کے نام مکہ مکرمہ سے بھیجا تھا) نہ صرف پوری رقم فراہم کی، بلکہ

مجھے اپنے ساتھ لے کر بمبئی گئے اور سفر کے سارے مراحل کی تکمیل کرا کے بذریعہ ہوائی جہاز اپنی پرخلوص دعاؤں اور پرنم آنکھوں کے ساتھ اس مبارک سفر پر روانہ کیا۔ واضح رہے کہ ان دنوں سفر حج کے لئے ملک کے متعدد مقامات کے بجائے صرف بمبئی ہی سے جانا ہوتا تھا۔ اس جگہ برسبیل تذکرہ یہ بیان کرنا بھی مناسب ہے کہ اس وقت جہاز کے کرایہ ودیگر مصارف کی مد میں صرف ساڑھے دس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ بمبئی کے صابوصدیق مسافر خانہ میں کان پور کے مفتی منظور احمد مظاہری صاحب سے ان کے دو نوجوان رفقاء کے ساتھ، نیز میرے دیرینہ رفیق مولانا ڈاکٹر سعید احمد صاحب فیض آبادی سے بھی ملاقات ہوگئی جو اسی جہاز سے سفر کررہے تھے جس سے میری بھی روانگی ہونے والی تھی، اور مفتی صاحب نے میری اس درخواست کو منظور کرلیا تھا کہ اپنے کانپور کے دونوں رفیقوں کے ساتھ ہم دونوں کو بھی اپنے رفاقت ورہنمائی میں ارکان حج ادا کرادیں۔ چوں کہ مفتی صاحب کا یہ چوتھا سفر حج تھا، اور وہ نہ صرف دینی مسائل سے، بلکہ وہاں کی تمام ضروریات اور تقاضوں سے بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی امارت ورہنمائی میں ہمارا یہ پورا سفر بہت ہی خوشگوار وبابرکت رہا اور قیام وطعام وغیرہ کی سہولیات کے ساتھ ہی حرمین شریفین کی حاضری نیز مقامات مقدسہ کی زیارت جیسے امور میں بھی مفتی صاحب کے تجربات سے ہم لوگوں نے خوب نفع اٹھایا۔ فجزاه الله عنا أحسن الجزاء۔

حج کے اس مبارک ومقدس سفر سے واپسی کے بعد اس کی کچھ مختصر روداد اسی وقت قلم بند کی تھی، جس کی روداد ''البدر'' کے فروری ۱۹۷۸ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ اب جو اپنے کچھ اہم سفرناموں پر مشتمل کتاب کی اشاعت کا فیصلہ ہوا تو اس تحریر کے ساتھ ہی اس شائع شدہ روداد سفر اور اس کے ساتھ ہی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سے بھیجے ہوئے ان دو خطوط کو بھی اس میں شامل کرلینا مناسب سمجھا۔ جن کو ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

زائر حرمین شریفین ایڈیٹر ''البدر'' کا مکتوب گرامی اپنے رفقاء کے نام

اصطفا منزل، مدینہ منورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخلص کریم جناب مولانا جمیل احمد ومولانا شبیر احمد صاحبان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس سے قبل ایک خط قاری حبیب الرحمٰن ـــــ صاحب کے نام بمبئی سے لکھا تھا جو ملا ہوگا اور آپ حضرات کے ملاحظہ سے گذرا ہوگا۔ حسب پروگرام ۶؍نومبر ۱۹۷۷ء کے طیارہ سے روانہ ہوکر اسی دن تقریباً ۵؍گھنٹے کے بعد یعنی ہندوستانی وقت کے اعتبار سے رات کو ۱۱؍بج کر ۲۰؍منٹ پر جدہ پہنچ گئے۔ کسٹم، کرنسی اور پاسپورٹ وغیرہ کے مراحل طے ہونے میں تقریباً ۴؍گھنٹے صرف ہوگئے اس کے بعد جدہ ہی کے ہوائی اڈہ پر کچھ دیر آرام کیا۔

نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اس فکر میں لگ گیا کہ کسی طرح دیار حبیب میں حاضری دوں۔ کئی گھنٹوں کی تگ ودو کے بعد بس مل سکی۔ بمبئی سے ہی رفقاء سفر میں خصوصیت کے ساتھ مولانا منظور احمد صاحب مظاہری مدیر پیام سنت کانپور اور مولانا سعید احمد صاحب فیض آبادی کے نام قابل ذکر ہیں جن کی رفاقت تا حال میسر ہے، اور ان شاء اللہ ان حضرات کا پورے سفر مبارک میں ساتھ رہے گا۔

بہرحال میں مع رفقاء سفر مدينة الرسول کے لئے روانہ ہوگیا۔ مولانا یقین جانیئے! دل کی عجیب کیفیت تھی، مدينة الرسول اور یہ ناکارہ! اللہ اللہ! کرم بے حساب کا کیا ٹھکانا! مگر مولانا! یقین جانیئے اس کیفیت کی صحیح ترجمانی میں الفاظ کے ذریعہ کر ہی نہیں سکتا ہوں جو اس وقت طاری تھی۔ بس اپنی پوری رفتار کے ساتھ آگے آگے بڑھتی جارہی تھی اور میری نظریں ان پہاڑوں اور

تو دوں کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ جنھوں نے کبھی سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کبار کے جلووں کی تابانی دیکھی ہے۔ مولانا! آپ خود سوچئے جب یہ یقین ہو کہ یہ وہی گھاٹیاں ہیں اور یہ وہی پہاڑ ہیں اور یہ وہی صحرائی ہیں جن پر سے کبھی سالار کارواں کا گذر ہوا ہے تو دل کی کیا کیفیت ہوگی۔ بس بے ساختہ دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر زبان سے درود شریف جاری ہو جاتا۔ اللھم صلی علی محمد و علیٰ آله و اصحابه و ازواجه و اهل بیته و بارك و سلم۔

بس مقام بدر پر پہنچی۔ وہ مقام تو دیکھ نہ سکا جہاں اسلامی کارواں کے نہتے فاقہ مستوں نے باطل کے عظیم لشکر سے نبرد آزما ہو کر حق کی سربلندی کا لوہا منوانے کا عدیم المثال تاریخی کارنامہ انجام دیا تھا۔ کیوں کہ وہ مقام کچھ فاصلہ پر تھا البتہ وہ ٹیلہ نظر آ رہا تھا۔ مولانا منظور احمد صاحب نے بتایا کہ اگر اس مقام کو دیکھنا ہو تو ڈرائیور سے پہلے سے بات کر کے اس کو آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کا پختہ ارادہ ہے کہ ان شاء اللہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے اس مقدس سرزمین کی ضرور زیارت کریں گے۔ بظاہر اس مقام سے جہاں بس رکی تھی، اس سنگلاخ وادی کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا جہاں اسلامی کارواں کو باطل کی طاقت کو پاش پاش کرانے کے لئے اپنے کو جوکھم میں ڈالنا پڑا تھا کیوں کہ موجودہ دور حکومت میں وہ مقام تو نہایت ہی دیدہ زیب بن چکا ہے۔ خوبصورت چوڑی سڑک چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزوں کی دکانیں۔ نماز پڑھنے کے لئے زنانہ و مردانہ مقامات اور وضوخانے و طہارت خانے، یہ تمام چیزیں اس چھوٹی سی جگہ پر موجود ہیں۔ تقریباً ۴۵ منٹ اس مقام پر ٹھہرنے اور نماز عصر ادا کرنے کے بعد بس پھر روانہ ہوگئی۔ مغرب کی نماز کے لئے ایک مقام پر رکی اور نماز کی ادائیگی کے بعد پھر روانہ ہوگئی، اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد قرب منزل کا احساس ہونے لگا۔ ذوالحلیفہ (بئر علی) آیا، جہاں سے احرام باندھ کر ان شاء اللہ ہم

لوگوں کو مکہ جانا ہے۔ بس اس مقام پر آہستہ بالکل آہستہ ہوگئی۔ چمکتے برقی قمقموں کے بیچ اس پر فضا مقام کو دیکھا اور اب بس روانہ ہوئی تو دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ گناہوں کے احساس کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آقا کے سامنے کیا منھ لے کر حاضر ہوں گا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد بس باب العنبر یہ میں جا کر رک گئی جو مدینہ منورہ کا سرکاری بس اسٹینڈ قرار پایا ہے۔ وہاں اترنے کے بعد پاسپورٹ پر ضابطہ کے مطابق اندراج ہوا۔ اور پھر ٹیکسی کر کے مزورہ کے گھر پہنچے۔ برسبیل تذکرہ یہ بھی بتا دوں کہ مدینہ منورہ کے لئے حکومت سعودی عربیہ کی طرف سے فاطمہ طوابہ نامی ایک خاتون کا بطور مزورہ ہم لوگوں کے لئے انتخاب ہوا ہے۔ اگر چہ حکومت نے مقامات مقدسہ میں قیام کی ذمہ داری لے رکھی ہے اور اس سلسلہ میں ہر زائر سے بطور کرایہ مکانات معتد بہ رقم لی جاتی ہے۔ مگر عالم یہ ہے کہ جب ہم لوگوں نے جا کر دریافت کیا تو مزورہ کے منشی نے بتایا کہ قیام کے لئے ہم کوئی بندوبست نہیں کر سکتے۔ بہر حال ہم لوگ اصطفا منزل میں آ کر ٹھہرے جو مسجد نبوی سے بالکل قریب یعنی باب عمرؓ کے بالکل سامنے ہے۔

نماز عشاء ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ اسی وقت غسل کیا اور الحمد للہ مستحب طریقہ کے مطابق مسجد نبوی میں حاضری دی۔ دل چاہا اور ارادہ کیا کہ باب جبرئیل سے داخلہ ہو کیوں کہ یہی افضل ہے۔ مگر وہ بند ہو چکا تھا۔ اس لئے باب النساء سے داخل ہو کر روضۃ الجنۃ میں نماز عشاء ادا کی اور پھر جھجکتے جھجکتے آقا کے دربار میں حاضر ہو کر درود وسلام کا نذرانہ پیش کیا۔ بارِ عصیاں سے گردن جھکی ہوئی تھی۔ عرق انفعال رواں تھے اور زباں پر الصلوٰۃ و السلام علیك یا رسول اللہ جاری تھا۔ کچھ دل سے کچھ زبان سے آقا سے عرض حال کرنے کے بعد صلوٰۃ الوتر ادا کر کے باب السلام سے واپسی ہوئی۔ یہ تھی پہلی مرتبہ حاضری کی سرگذشت! اب تک الحمد للہ سات نمازیں با جماعت مسجد نبوی میں ادا ہو چکی

ہیں۔ دعا کیجئے کہ اللہ پاک قبول فرمائے۔ انشاء اللہ چالیس نمازوں کی ادائیگی
کے بعد ۷؍ذی الحجہ کو مکہ کے لئے روانگی ہوگی۔ دربار رسالت میں کئی مرتبہ
حاضری دے چکا ہوں۔ آپ سبھی حضرات کا نام لے لے کر سلام پہنچایا اور آپ
لوگوں کے لئے بھی اس سعادت کے نصیب ہونے کی دعا خصوصاً صفہ پر آپ
لوگوں کے لئے دعا کی جو ان شاء اللہ قبول ہوگی۔ اب آپ لوگ بھی میرے
لئے دعا کریں کہ حق تعالیٰ تمام ارکان کو مع اس کے سنن و مستحبات بحسن و خوبی
انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

اچھا اب اجازت دیجئے۔ اب مکہ پہنچ کر ان شاء اللہ خط لکھوں گا۔ جملہ
احباب خصوصاً قاری صاحب و مولانا کاظم صاحب و مولانا فضل الرحمٰن صاحب
سے سلام کہئے اور تمام طلبہ کو دعائیں اور تمام اساتذہ و طلبہ سے دعاء کی
درخواست۔

فقط

عبدالعلی فاروقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکہ مکرمہ

محلّہ جیاد، پوسٹ بکس ۴۷۹

مکرم و محترم جناب مولانا شبیر احمد صاحب و مولانا جمیل احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

اس سے قبل ایک خط اپنی خیریت کا بمبئی سے قاری محمد حبیب الرحمٰن
صاحب کے نام اور دوسرا مدینہ منورہ سے آپ ہی دونوں حضرات کے نام روانہ
کر چکا ہوں۔ جس میں مدینہ منورہ تک پہنچنے اور وہاں کے قیام کی بابت تحریر کیا
تھا۔ اور مدینہ منورہ والے خط میں یہ بھی تحریر کیا تھا کہ اب مکہ مکرمہ سے خط بھیجوں

گا۔

مدینہ طیبہ سے وہاں کی تاریخ کے اعتبار سے ۵؍ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ کو صبح
روانہ ہوکر ۶؍کو علی الصبح مکہ پہنچا۔ مدینہ سے مکہ کی مسافت ویسے تو ڈھائی اور
پونے تین سو میل کے درمیان ہے اور عموماً یہ سفر بذریعہ بس ۷؍سے ۸؍گھنٹے کے
درمیان طے ہوجاتا ہے، مگر آج کل موسم حج میں یہ سفر اگر ۱۶؍گھنٹوں میں بھی
طے ہوجائے تو غنیمت ہے، اس کا علم تو آپ حضرات کو ہوگا ہی کہ یہاں
ریلوے لائن نہیں ہے اس لئے ٹیکسی، بس یا پھر ہوائی جہاز ذرائع سفر ہیں۔
بہرحال اپنے حساب سے ۶؍ذی الحجہ کو نماز تہجد کے وقت مکہ مکرمہ پہنچا۔ معلّم
کے دفتر آیا، تو وہاں اشتہار آویزاں دیکھا، جس سے علم ہوا کہ تاریخ بدل دی گئی
ہے اور ۲۹؍کی رویت تسلیم کر لی گئی ہے، گویا اس دن ۷؍ذی الحجہ قرار پائی۔

مولانا! مدینہ گیا تھا بڑے ولولے لے کر، نہ جانے کب کی تمنا پوری ہوئی
تھی۔ اس کا اندازہ بس آپ اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں کہ جو والد ماجد مدظلہ کا
بیان کردہ ہے اور مجھے یاد بھی نہیں ہے، انہوں نے فرمایا کہ ۱۹۶۱ء میں جب
والدین، ہمشیرہ اور عزیزی مولانا عبدالولی سلّمہٗ حج کے لئے آئے تھے تو میں نے
والدہ محترمہ کو اپنی ٹین کی بکسیا دے دی تھی کہ اسے مدینہ طیبہ لیتی جائیے، میں
نہیں جارہا ہوں تو میری پٹاری ہی چلی جائے گی۔ والد ماجد مدظلہ نے یہ واقعہ
میرے سفر پر روانگی سے کچھ ہی قبل بیان کیا، اور اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے
وہ آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا کہ جب تمہاری والدہ نے مکہ میں مجھے یہ بتایا کہ تم نے
اپنی بکسیا یہ کہہ کر بھیجی ہے تو میرا دل بے چین ہوگیا اور میں نے ہر ہر مقام
اجابت پر تمہاری حاضری کے لئے دعا کی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم اس سفر مبارک پر
جارہے ہو، اللہ تم کو مبارک کرے۔

مولانا! یقیناً میرے دل میں حسرت تھی، ساتھ ہی مجھے یقین تھا کہ دیار
نبوی میں حاضری ضرور ہوگی، جس کا اظہار بھی کیا

چاندنی شب کا نور دیکھیں گے
آپ کا در حضور دیکھیں گے
یہ تو محشر کو ہے یقیں آقا
ہم مدینہ ضرور دیکھیں گے

دل کی تڑپ کام آئی، والدین کی دعائیں قبول ہوئیں۔ اللہ پاک نے اپنے نبی کا دیار دکھادیا اور خدا کے پاک اور مقدس کعبہ کے جوار میں بیٹھ کر آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں، مگر میں آپ سے کیسے کہہ دوں کہ حسرت پوری ہوگئی، جہاں تک مکہ مکرمہ کا سوال ہے تو الحمدللہ ابھی یہاں موجود ہوں اور ۱۵/دن مزید رہنا ہے اس لئے قلب مطمئن ہے۔ مگر مدینہ چھوٹ گیا، باحسرت وغم اس شہر مقدس کو چھوڑنا پڑا۔ جس کے ذرہ ذرہ سے مسلمان کو جذباتی تعلق ہے۔ مولانا! میں کیسے بتاؤں کہ مدینہ کیسا شہر ہے مکان کو جو شرف حاصل ہے وہ تو ہے ہی آج بھی وہاں کے مکین اپنی شرافت ومحبت اور خوش اخلاقی سے اس کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ ان ہی کی اولاد ہیں جن کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تھا، اور جب ہر طرف سے مخالفتیں ہورہی تھیں تو ان کی ننھی ننھی بچیاں طلع البدر علینا من ثنیات الوداع کہہ کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کررہی تھیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر سرزمین مدینہ آرام گاہ ہے فخر دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی، یقین جانئے جب اس مبارک زمین سے روانہ ہونے لگا ہوں تو دل کی عجیب کیفیت تھی۔ در حضور پر جب آخری سلام کے لئے حاضری دی ہے تو دل بے چین ہوگیا۔ خدا گواہ ہے کہ دل چاہتا تھا کہ ہٹوں ہی نہیں، مگر آنا تو تھا ہی پلٹ پلٹ کر بے قرار نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ آپ تمام حضرات کا بھی آخری سلام پہنچا دیا ہے، بہر حال اب اس کیفیت کا اظہار تو اس مختصر عریضہ میں ہو نہیں سکتا۔ مختصراً اتنا عرض کروں کہ الحمدللہ حج بخیر وعافیت ہوگیا۔ ہندوستانی تاریخ کے اعتبار سے ۶/یا پھر ۷/ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ یعنی

۱۹/نومبر ۱۹۷۷ء یوم شنبہ کو حج ہوا۔ بفضلہ تعالیٰ میں نے قران کا احرام باندھا تھا، چھٹے دن احرام کھلا، خداوند قدوس نے یہ تمنا بھی پوری کردی کہ حنفی مسلک کے مطابق سب سے افضل طریقہ سے حج نصیب ہوا۔ ہندوستان سے آنے والے بہت کم حاجی قران کر پاتے ہیں عموماً لوگ تمتع کرتے ہیں مگر مجھے بفضلہ تعالیٰ قران کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آپ سب حضرات دعا کریں کہ حق تعالیٰ باقی ایام بھی خیر وعافیت سے گذار دے اور اس مقدس سرزمین پر اپنی مرضی کے مطابق رکھے۔ آمین۔

میری واپسی کا قطعی پروگرام کل معلوم ہوگا جس کا علم آپ حضرات کو گھر سے ہی ہوجائے گا۔ مولانا محمد کاظم صاحب، مولانا فضل الرحمٰن صاحب ودیگر مدرسین سے سلام اور طلبہ سے دعا کہہ دیں۔

والسلام
عبدالعلی فاروقی

خداوند قدوس کی اس نعمت بے پایاں کا شکر یہ کس طرح ادا کیا جائے کہ اس نے حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت بخشی، مکہ مکرمہ وہ شہر مقدس جس کا چپہ چپہ رحمتوں اور برکتوں کا خزینہ ہے، وہ شہر مقدس جس میں حرم الٰہی ہے، کعبۃ اللہ جس کی عظمت کا فطری طور پر انسان بحیثیت انسان ہی کے قائل ہوا ہے۔

حجر اسود جسے دیکھ کر ایک مومن کو امن وآشتی کے علم بردار اور اپنے سالار کارواں یعنی ہادی اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد بے اختیاری طور پر بے چین کردیتی ہے کہ کیسی خوبی کے ساتھ عرب کے جنگجو قبائل کی کھنچی ہوئی تلواروں کو اسی حجر اسود کے نصب کے معاملہ میں میرے آقا نے میانوں میں رکھوادیا تھا۔

میزاب رحمت، رحمت الٰہی کا خزینہ، رکن یمانی مقام اجابت، ملتزم، یعنی گناہوں کی یاد دلانے والا وہ مرکز کہ جس سے لپٹ کر سنگدل سے سنگدل

انسان کا قلب بھی جیسے پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور لپٹ کر پھر الگ ہوتے وقت حسرت بھری نگاہ اس پر ضرور پڑتی ہے۔

مقام ابراہیم، خدا کے برگزیدہ نبی ابراہیم خلیل اللہ کی وہ عظیم یادگار جسے دیکھ کر اخلاص وعمل جہد واستقامت کے کوہ گراں یعنی ابراہیم خلیل اللہ اور ان کے فرزند عالی مقام اسماعیل ذبیح اللہ علیہما السلام کی یاد بے اختیاری طور پر قلب مومن پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ پیروں کے وہ نشانات معمار کعبہ کی یاد سے غافل نہ ہونے کی دعوت دیتے ہیں، اور اخلاص کامل کی اس عظیم یادگار کو دیکھ کر بے اختیار دعا کے لئے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں۔

صفا ومروہ، دو پہاڑ سیدہ ہاجرہ کی تڑپ وممتا، اور دوسری طرف اعتماد علی اللہ، رحمت خداوندی سے آس کی وہ زندۂ جاوید یادگار جو قیامت تک دلوں کو گرماتی رہے گی، پھر اس میں میلین اخضرین کا درمیانی حصہ، کیسی مسرت محسوس کرتا ہے مسلمان جب اس مقدس زمین پر دوڑ رہا ہوتا ہے اور ہاجرہ کی اس سنت پر عمل کرتے ہوئے اس کے دل کو کتنی خوشی ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو، جب خالق کائنات کو ہاجرہ کی یہ ادا اتنی بھائی کہ اب اس پر قیامت تک عمل کرایا جائے گا۔

غرضیکہ کن کن چیزوں کا ذکر کیا جائے، وہ تو پورا شہر انوار وتجلیات کا گہوارہ ہے۔

مدینۃ الرسول ! کتنا پیارا ہے یہ نام اور کیسی خوش نصیب ہے وہ سرزمین جسے امام الانبیاء کا شہر کہلانے کا شرف حاصل ہے، مسجد نبوی دو ننھے انصاری یتیموں کی چھوٹی سی زمین پر بنی ہوئی وہ مسجد جو آج اپنی بے پناہ وسعت کے باوجود وسعت کی طالب ہے، جس کے ایک ایک ذرہ سے مومن کو جذباتی تعلق ہے۔ کیوں کہ اسی مسجد میں روضۃ الجنۃ ہے، جنت کی کیاری جس وقت مومن اپنی آنکھوں سے اسی دنیا میں دیکھتا ہے تو اس کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے اس کا اظہار زبان وقلم سے ممکن نہیں ہے۔ استون حنانہ، استون عائشہؓ، استون ابی

لبابہؓ، استوانۃ السریر، استوانۃ الوفود، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثاروں کی وہ لافانی یادگاریں جہاں اضطراری طور پر سجدے نصب کرنے کے لئے دل چاہتا ہے تاکہ یہ مقدس یادگاریں ہمارے سجدوں کی بھی امین ہو جائیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر مومن بیمار کی شفاء، آرزوئے مسلم کی معراج، بے سہارا انسانیت کا سہارا، یعنی سرور کائنات فخر موجودات محسن انسانیت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی آرام گاہ اسی مسجد میں ہے، جہاں سرکار اپنے ان دو رفیقوں کے ساتھ جنہوں نے اعتماد کامل کی سند سرکار کی زبان حقیقت بیان سے حاصل کر لی تھی آرام فرما ہیں۔

آہ! در رسول پر حاضری کی کیفیت کس طرح احاطۂ تحریر میں آسکتی ہے۔ شوق دیدار کہتا ہے کہ آگے بڑھو، گناہوں سے بوجھل قدم رک رک جاتے ہیں، دل بے اختیار کہتا ہے کہ ان سے زیادہ اپنا کون ہے؟ ہر درد وغم کہہ ڈالو، لیکن آلودۂ عصیاں زبان کچھ کہنے سے معذوری ظاہر کرتی ہے، کچھ عرق انفعال ترجمانی کرتے ہیں اور کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ بھی۔ اس عالم میں حاضری ہوتی ہے اور پھر یہی عالم ہر مرتبہ حاضری کے وقت رہتا ہے۔

ایسے متبرک اور مقدس مقامات پر خداوند قدوس نے اپنے ایک ناکارہ اور آلودۂ عصیاں بندے کو حاضری کی سعادت بخشی، اب بھلا اس نعمت عظمیٰ کے شکریہ کی ادائیگی کیوں کر ہوسکتی ہے، کہاں یارا زبان میں اور کہاں طاقت قلم میں؟ ہاں یہ آرزو ضرور ہے کہ خداوند قدوس پھر ان مقدس مقامات کی زیارت کی سعادت بخشیں، صرف مجھے ہی نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کو اس سرزمین پر حاضری کی دولت ملے۔ آمین۔

☆☆☆

جنوب کا ایک سفر

جنوبی ہند کی سابقہ ریاست حیدرآباد سے اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر ہندوستان کے دو سب سے بڑے مذہبوں کے ماننے والے یعنی ہندو اور مسلمانوں کا جذباتی تعلق رہا ہے۔ گو کہ حیدرآباد آج کوئی ریاست نہیں بلکہ ریاست آندھرا پردیش کا ایک شہر ہے لیکن آخری نظام حیدرآباد عثمان علی خان کے دور تک اسے ایک ریاست ہی کا درجہ حاصل تھا جس میں حیدرآباد کے علاوہ دوسرے اضلاع بھی شامل تھے اور جسے بعد میں تلنگانہ کے نام سے یاد کیا گیا۔

یوں بھی جب ہماری قدیم تہذیبوں اور معاشروں کا ذکر آتا ہے تو اس میں حیدرآبادی تہذیب کا نام بھی ایک منفرد تہذیب کی حیثیت سے لیا جاتا ہے یہ الگ بات ہے کہ مرور زمانہ اور اختلال ایام نے ہماری دیگر تہذیبوں کے نقوش کی طرح حیدرآباد کی تہذیب کے نقوش کو بھی بالکل دھندلا کر دیا ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں جب سابقہ ریاست حیدرآباد کے ایک شہر محبوب نگر سے جو آج کے شہر حیدرآباد سے تقریباً سو کلو میٹر جنوب میں واقع ہے نومبر ۱۹۸۲ء میں مجھے ایک جلسہ میں شرکت کے لئے دعوت نامہ ملا تو میں نے وہاں جانے کا ارادہ دو وجہوں سے کر لیا ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ محبوب نگر اور پھر اس کے طفیل میں حیدرآباد اور حیدرآبادیت کو قریب سے دیکھنے کا جذبہ اور دوسری اس سے بھی زیادہ اہم وجہ ''اسٹڈیز سینٹر پالموز'' کی طرف سے ملے ہوئے دعوت نامہ میں درج جلسہ کا عنوان تھا۔

پہلی وجہ کو تو تاریخی و تہذیبی روایات سے واقفیت کا شوق، یا ہلکے پھلکے عام لفظوں میں گھومنے پھرنے کے اشتیاق کا عنوان دیا جاسکتا ہے لیکن دوسری وجہ کی حیثیت یہ نہ تھی بلکہ اسے ٹھیک ٹھیک لفظوں میں ملت اسلامیہ کی ایک اہم ضرورت اور مذہبی فریضہ کے نام سے ہی یاد کیا جاسکتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسے مسلمانوں کی بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام کے خلاف فتنوں کو اگرچہ آپ کے غلاموں یعنی صحابہ کرامؓ نے پوری قوت کے ساتھ کچل دیا اور صاف و بے داغ مذہب اسلام آج ہمارے ہاتھوں تک پہنچ گیا۔ مگر جب مذہبی تاریخ مدون کر کے لکھی گئی تو سازشی تحریکوں اور ان کے بانیوں کے افکار و نظریات کو اس میں بے تکلف راہ دے دی گئی۔ نتیجہ کے طور پر آج مذہبی تاریخ کے نام سے ہمارے پاس جو سرمایہ ہے اس میں کا بیشتر حصہ ہم کو یہ تاثر دیتا ہے کہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ناکام قائد تھے جن کا برپا کیا ہوا نظام آج پندرہویں صدی کا کیا ذکر، پہلی ہی صدی میں پوری طرح درہم برہم ہو چکا تھا۔

دوسری زبانوں کو جانے دیجئے ہم اپنی مادری زبان اردو کے سلسلہ میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس زبان میں اسلامی تاریخ پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، انفرادی طور پر بھی اور باقاعدہ اداروں کی طرف سے بھی۔ لیکن ان تاریخوں کے مطالعہ سے کیا ہم اس نتیجہ پر نہیں پہنچتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جیسے تیسے خلافت راشدہ کا دور تو گذر گیا، لیکن خلافت بنو امیہ قائم ہوتے ہی اسلام کے آثار و نشانات مٹنا شروع ہو گئے اور بنو امیہ کی ایک صدی پر پھیلی ہوئی امارت کی تاریخ میں سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے (جن کا دور امارت دو سال سے کچھ ہی زائد ہے) کوئی بھی قائد و حکمراں ٹھیک ٹھیک اسلامی ڈگر پر نہیں چل سکا؟ اور مقام عبرت یہ ہے کہ یہ تاثر ہمیں ان تاریخی کتابوں سے مل رہا ہے جن کو مرتب کرنے والے مسلمان ہی ہیں۔

’’اسٹڈیز سینٹر‘‘ محبوب نگر کے باہمت وجواں حوصلہ اراکین نے ۴۰ھ (عام الجماعۃ) میں حضرت معاویہؓ اموی اور حسن بن علی ہاشمی کے درمیان ہونے والی تاریخ ساز صلح اور اس کے پس منظر و پیش منظر کو اپنے جلسہ کا عنوان بنایا تھا۔

خیرالقرون کے واقعات کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ یہ صلح اسلام کے خلاف برپا کی جانے والی سب سے خطرناک اور سازشی تحریک ’’سبائیت‘‘ کے منہ پر بھرپور طمانچہ تھی اور بنوہاشم و بنوامیہ کے درمیان مسلسل تاریخی کذب بیانیوں کے ذریعہ قائم کئے جانے والے فرضی اختلافات کا سدباب بھی۔

حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ہونے والی صلح اور اس کے خوشگوار نتائج اور پھر اس سلسلہ میں سبائیوں کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ انگیزیوں کا جتنی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے گا اور حضرت حسنؓ اور ان کے لائق ساتھیوں اور مشیران کار پر جس قدر اعتماد کیا جائے گا اسی قدر تاریخ کی صحیح کڑیاں ہمارے ہاتھ آتی چلی جائیں گی اور حضرت حسنؓ کی فطانت ولیاقت کو سبائی پروپیگنڈہ کے زیر اثر جس قدر مطعون کیا جائے گا اسی قدر اسلامی تاریخ داغ دار ہوگی اور پھر وہی تاریخ ہمارے سامنے آئے گی جسے آج عام طور پر اسلامی تاریخ کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ گویا ۴۰ھ ہماری مذہبی تاریخ کے بعد کے نقطۂ آغاز کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جہاں سے سبائیوں کو ہماری تاریخ میں دخل اندازی کا موقع ملا۔ اس لئے اسٹڈیز سینٹر محبوب نگر کے ذمہ داروں کی طرف سے ۴۰ ہجری میں ہونے والی انقلابی وحیات بخش صلح کو عنوان بنانا نہ صرف میری نظر میں ہمت مردانہ تھی بلکہ اس جلسہ میں شرکت کرنا میں نے اپنی مذہبی ذمہ داری بھی سمجھا۔

چنانچہ جلسہ اور مجلس مذاکرہ (سمینار) کے لئے ۵، ۶/فروری ۱۹۸۳ء کی تاریخیں مقرر ہوگئیں اور میں نے اپنا اور برادر عزیز مولانا عبدالولی فاروقی سلّمہٗ

کا لکھنؤ سے حیدرآباد کے لئے یکم فروری ۱۹۸۳ء کا ریزرویشن بھی کرالیا لیکن دسمبر ۱۹۸۲ء کے اواخر میں ایک ناگہانی حادثہ کا شکار ہوکر میں زخمی ہوگیا (جس کی تفصیل اور اس سلسلہ میں خدائے بزرگ و برتر کے خصوصی انعام کی تفصیل فروری ۱۹۸۳ء کے ’’البدر‘‘ میں لکھی جاچکی ہے) اس کی اطلاع جب ہمارے داعین کو ملی تو انہوں نے میری بحالی صحت کا لحاظ کرتے ہوئے مارچ ۱۹۸۳ء تک کے لئے جلسہ کو ملتوی کردیا۔ چنانچہ بعد میں ۱۲، ۱۳/مارچ ۱۹۸۳ء کی تاریخیں مقرر ہوئیں۔

اپنے اس پروگرام کی اطلاع حیدرآباد میں میں نے اپنے بزرگ و مخلص ڈاکٹر مسعود حسن صاحب کاکوروی کو بھی دے دی تھی اور ان کی خواہش پر پروگرام اس طرح مرتب کیا تھا کہ کچھ وقت ان کے ساتھ حیدرآباد میں بھی گذار سکوں۔ چنانچہ ۸/مارچ ۱۹۸۳ء کو میں اور برادر عزیز مولوی عبدالولی فاروقی سلّمہٗ لکھنؤ جھانسی فاسٹ پسنجر سے روانہ ہوئے۔ اس ٹرین کی لکھنؤ آمد کا وقت ۳:۱۵/ اور چھوٹنے کا وقت ۳:۵۵ ہے، ہماری ٹرین لکھنؤ سے تو تقریباً وقت پر ہی روانہ ہوئی اور خیال یہ تھا کہ دونوں ٹرینوں کے درمیان تین گھنٹہ سے زائد کا وقفہ ہے اس لئے ہم کو ’’دکن ایکسپریس‘‘ آسانی سے مل جائے گی۔ لیکن جھانسی پسنجر لکھنؤ سے نکلتے ہی ہندوستانی ریلوں کے روایتی جوہر دکھانے لگی اور رکتی رکاتی بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں لڑھکتی ڈھلکتی ہوئی کانپور اسٹیشن رات کو ۸:۳۰/بجے پہنچی۔ ’’دکن ایکسپریس‘‘ کے چھوٹنے کا کھٹکا تو پیدا ہوچلا تھا مگر یہ آس بہرحال قائم تھی کہ اگر اس کے بعد مزید لیٹ نہ ہو تو جھانسی پہنچ کر دکن ایکسپریس مل جائے گی۔ کانپور اسٹیشن ہی پر ہم لوگوں نے نماز عشاء ادا کرلی۔ اور کھانا بھی کھالیا۔ ۹/بجے کے کچھ بعد ٹرین کانپور سے روانہ ہوئی۔ ’’البدر‘‘ میں تبصرہ کے لئے آئی ہوئی کچھ کتابیں اور کچھ دوسری کتابیں میں نے راستہ میں مطالعہ کے لئے رکھ لی تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا مطالعہ کرتے کرتے نیند

آ گئی ٹھیک ۳؍بجے آنکھ کھلی تو ابھی ٹرین چل ہی رہی تھی اب فطری طور پر یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر آدھ گھنٹہ کے اندر ٹرین جھانسی نہیں پہنچ جاتی ہے تو دکن ایکسپریس ملنے میں دشواری ہوگی۔ اسی فکر میں پھر نیند بھی نہ آسکی۔ خدا خدا کر کے صبح ۴؍بج کر ۴۵؍منٹ پر ٹرین جھانسی پہنچی یعنی مقررہ وقت سے پورے ۴؍گھنٹے تاخیر سے۔ جھانسی پہنچنے پر یہ علم ہو کر اطمینان ہوا کہ آج دکن ایکسپریس بھی لیٹ ہے اور ابھی تک آئی نہیں ہے۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ بڑی زحمتوں سے بچ گئے ورنہ نہ معلوم کیا حشر ہوتا اور کب حیدرآباد پہنچ سکتے۔

لگ بھگ پونے تین گھنٹہ تاخیر سے ٹھیک ۶؍بجے صبح دکن ایکسپریس جھانسی آئی اور یہاں مزید لیٹ ہو کر ۷؍بجے صبح روانہ ہوئی۔ چونکہ جھانسی سے حیدرآباد تک اس ٹرین کا سفر ۲۴؍گھنٹہ سے بھی زیادہ کا ہے اس لئے خیال یہ تھا کہ راستہ میں اس تاخیر کی کافی حد تک تلافی ہو جائے گی۔ مگر توبہ کیجئے پھر وہ ہندوستانی ریلوے کا نظام ہی کیا ٹھہرا جو ایسی خرافاتی باتیں سوچی جائیں۔ یہاں تو ٹرینوں کے لیٹ ہونے پر بجائے باز پرس ہونے کے اوور ٹائم کا بھتہ ادا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ ٹرین جسے دوسرے دن صبح ۶؍بج کر ۱۵؍منٹ پر حیدرآباد پہنچنا چاہئے تھا دن میں ۱۱؍بجے کے قریب پہنچی۔ مسلسل ۴۴؍گھنٹے کے سفر کی وجہ سے ہم لوگوں کو جو تکان ہو سکتا تھا وہ سب یہ دیکھ کر فراموش ہو گیا کہ بیچارے ڈاکٹر مسعود حسن صاحب اپنی ضعیفی و معذوری کے باوجود صبح ۶؍بجے سے اس وقت تک ہم لوگوں کے انتظار میں اسٹیشن پر موجود ہیں۔ باوجودیکہ ہمارا کوئی قصور نہ تھا مگر ڈاکٹر صاحب کی اس طرح پریشانی کا خیال کر کے نہ جانے کیوں ہم اپنے آپ کو مجرم سمجھ کر شرمندہ سے ہو گئے۔ مگر چوں کہ ڈاکٹر صاحب بھی اسی جنت نشان ہندوستان کے رہنے والے ہیں اس لئے انہوں نے اس تاخیر کا کوئی اثر نہ قبول کرتے ہوئے بڑی اپنائیت کے ساتھ ہماری شرمندگی کو دور کیا اور اسٹیشن سے ہم لوگوں کو اپنے مکان جو محلّہ اے سی گارڈ میں واقع ہے لے گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے دوپہر کا کھانا بڑے اہتمام کے ساتھ کھلایا۔ کھانے پر دیگر لذیذ چیزوں کے ساتھ حیدرآبادی ذوق کے مطابق کئی قسم کے اچار بھی تھے کیوں کہ حیدرآباد میں مرچ اور کھٹائی کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم لوگ لیٹ گئے، کچھ دیر قیلولہ کرنے کے بعد نماز ظہر کے لئے اٹھے۔ ابھی نماز سے فراغت ہی ہوئی تھی کہ دو صاحبان ڈاکٹر صاحب کو پوچھتے ہوئے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ملاقات کے بعد ان کو ہم لوگوں کے پاس پہنچا دیا معلوم ہوا کہ یہ دونوں صاحبان محبوب نگر سے آئے ہیں۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ یہ دونوں اسٹڈیز سینٹر کے رکن محمد خلیل احمد صاحب اور سید جہانگیر صاحب ہیں۔ لکھنؤ سے چلتے ہوئے ہمارا پروگرام یہ تھا کہ حیدرآباد پہنچنے کے بعد اس روز یعنی ۱۰؍مارچ کو ڈاکٹر صاحب کے یہاں ہی قیام کریں گے اور حیدآباد کے کچھ دوسرے احباب سے بھی ملاقات کریں گے اور ۱۱؍مارچ کو کسی وقت محبوب نگر کے لئے روانہ ہوں گے۔ مگر خلیل صاحب اور جہانگیر صاحب نے بتایا کہ ہم لوگ صرف آپ لوگوں کو لینے کے لئے ہی محبوب نگر سے آئے ہیں اور یہ خواہش کی کہ ہم لوگ ان کے ساتھ آج ہی محبوب نگر چلیں۔ ہم لوگوں نے یہ بھی سوچ کر کہ نئی جگہ ہے واقف رہبر کے ساتھ سفر آسان ہوگا ڈاکٹر صاحب سے اصرار کر کے اجازت حاصل کی اور نماز عصر ادا کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہو کر ہم لوگ بس اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گئے۔ ۸؍بجے رات کو محبوب نگر کے لئے بس ملی جو بہت تیز رو اور نان اسٹاپ تھی اس لئے ہم لوگ ۱۰؍بجے رات کے کچھ ہی بعد محبوب نگر بس اسٹیشن پہنچ گئے۔ بس اسٹیشن پر اسٹڈیز سینٹر کے خزانچی بابو صاحب اپنے ۸-۱۰؍ساتھیوں کے ساتھ جیپ لئے ہوئے موجود تھے۔

وہاں سے اسی جیپ پر سوار ہو کر تھوڑی ہی دیر میں ہم لوگ عبدالوہاب صاحب (جو اسٹڈیز سینٹر اور محبوب نگر کے ایک دینی ادارہ مدرسہ مدینۃ العلوم

دونوں کے معتمد ہیں) کے مکان پر آگئے جو ہم لوگوں کی قیام گاہ تھی ۔ یہاں اسٹڈیز سینٹر کے دوسرے تمام اراکین کے علاوہ شہر کے دیگر معززین سے بھی ملاقات ہوئی، کچھ دیر ان حضرات سے گفتگو کرنے پھر کھانا کھا کر نماز عشاء ادا کرنے کے بعد ہم لوگ سو گئے ۔

دوسرے دن ۱۱/ مارچ ۱۹۸۳ء کو جمعہ تھا، فجر کی نماز کے بعد ہی سے ملاقات کے لئے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اراکین نے خواہش ظاہر کی کہ اگر چہ اصل پروگرام دوسرے دن ۱۲/ مارچ کو بعد نماز عشاء ہے لیکن آج جامع مسجد میں بعد نماز جمعہ بھی ایک تقریر ہو جائے ۔ اس جگہ ایک بات لائق ذکر اور قابل تقلید ہے کہ اسٹڈیز سینٹر کے اراکین اور اس کے سرپرست وروح رواں جناب محمد سالم صاحب سدوسی کی مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں محبوب نگر میں نماز جمعہ جامع مسجد ہی میں ادا کرنے کا بہت اہتمام نظر آیا۔ محترم سالم سدوسی صاحب نے اس سلسلہ میں اپنی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے کس طرح اس مقصد کے حصول کے لئے متعدد دور دراز کے سفر کر کے علماء کے فتاویٰ حاصل کئے اور مخالفتوں ومزاحمتوں کے باوجود برسہا برس سے کس طرح مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے ان لوگوں کی کوششیں جاری ہیں۔ شکر اللہ سعیہم۔

بعد نماز جمعہ تقریر کے لئے دور خلافت راشدہ کی برکتوں اور خلفائے راشدینؓ کے بے مثل طرز حکمرانی کا بیان عنوان قرار پایا تا کہ اگلے دن حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین ہونے والی صلح کے سلسلہ میں جو بیان ہو اس سے ربط قائم ہو جائے اور خلفائے راشدین کا منہاج سامنے آجائے اور جب خلافت بنوامیہ کے سلسلے میں تبصرہ کیا جائے تو اسی روشنی میں تاریخ میں شامل ہوجانے والی خرافات کی حقیقت بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو صحیح سمت میں سوچنے کی دعوت دی جا سکے ۔ یہ تقریر ایک گھنٹہ سے کچھ زائد ہوئی اور بفضلہٖ تعالیٰ

عنوان سے متعلق کام کی کافی باتیں بیان ہوگئیں نیز حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کو سبائی تحریک کی پہلی کامیابی قرار دیتے ہوئے یہ عرض کر دیا گیا کہ اس تحریک کے پس منظر اور بانی تحریک عبداللہ بن سبا اور اس کے ساتھیوں کی ریشہ دوانیوں اور خفیہ سازشوں کی تفصیلات کل جلسہ عام میں بیان کی جائیں گی ۔ حیدرآباد کے والیان ریاست، جو نظام کے لقب سے ملقب ہوئے اگر چہ سنی مذہب سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان نظاموں کے مشیران خصوصی اور وزیر اعظم جو کہ ''سالار جنگ'' کے نام سے یاد کئے گئے وہ شیعہ ہی رہے اور ان سالار جنگ صاحبان کا نظام صاحبان پر ہمیشہ ہی تسلط رہا خصوصاً آخری نظام عثمان علی خاں تو پوری طرح اپنے سالار جنگ کے مذہبی اثرات کو قبول کر چکے تھے۔ نتیجہ کے طور پر الناس علی دین ملوکھم کے کلیہ کے مطابق رعایا میں بھی شیعیت اور سبائیت نے پوری طرح گھر کر لیا اور اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی کم سے کم تفضیلیت نے جڑ پکڑ لی یعنی وہ لوگ جو سنیت کے دعویدار رہے انہوں نے بھی اہلسنت و جماعت کے متفق علیہ عقیدہ کے خلاف یہ عقیدہ رکھا کہ حضرت علیؓ کو تمام اصحاب نبی حتیٰ کہ حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ پر بھی فضیلت حاصل ہے۔

ان حالات میں اس کی کم ہی امید تھی کہ سبائیت کی حقیقت اور اس کی خفیہ کارروائیوں کو جاننے میں لوگوں کو عمومی دلچسپی ہوگی۔ مگر ۱۲/ مارچ ۱۹۸۳ء کی شب میں بعد نماز عشاء ہونے والے جلسہ عام میں جس بڑے پیمانے پر محبوب نگر اور حیدرآباد کے لوگوں نے شرکت کی اور آخر تک جس دلچسپی اور دلجمعی کا مظاہرہ کیا اس نے پہلے کے اندازوں کو غلط ثابت کر دیا اور اس سلسلہ میں اسٹڈیز سینٹر محبوب نگر کے جواں سال وجواں حوصلہ کارکنوں کو عموماً اور اس کے روح رواں جناب محمد سالم صاحب سدوسی کو خصوصاً مبارکباد پیش نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔

اس جلسۂ عام میں محبوب نگر کے ایک معزز وکیل اور سالم سدوسی صاحب کے رفیق کار جناب وحید بیگ صاحب کی ابتدائی تعارفی تقریر کے بعد برادر

عزیز مولوی عبدالولی فاروقی سلّمہٗ کی تقریر ہوئی جس میں انہوں نے صحابیت
کے مقام اور خلفائے راشدینؓ کے بے مثل کارناموں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ
ساتھ امت کا رشتہ صحابہ سے توڑنے کی سبائی کوششوں کو بھی بیان کیا۔ اسی ذیل
میں موصوف نے حادثۂ کربلا کا بھی ذکر کیا کہ کس طرح قاتل ہی چارہ گر بننے کی
کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

اس کے بعد راقم الحروف نے تفصیلی طور پر حضرت معاویہ امویؓ اور
حضرت حسنؓ ہاشمی کے درمیان ہونے والی تاریخ ساز صلح کے پس منظر و پیش منظر
اور اس سلسلہ میں مخالف و موافق دونوں قسم کے ردعمل کو بیان کیا ساتھ ہی مسلّمہ
تاریخی حقیقتوں کے ذریعہ یہ بات بھی پیش کی کہ اس صلح سے مسلمانوں کو امن
واطمینان نصیب ہوا اور اس پر ان کو خوشی ہوئی اور سبائی منافقوں کو اپنا مشن
ناکام ہوتے دیکھ کر اس صلح سے ناگواری ہوئی اور انہوں نے ٹھیک اسی طرز عمل کا
مظاہرہ کیا جو وہ اس سے پہلے ام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کے
درمیان ہونے والی صلح کے موقع پر کر چکے تھے۔ مگر فرق صرف اتنا رہا کہ اُس
موقع پر منافقوں کو رات کی تاریکی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر صلح کو سبوتاژ کرنے کا
موقع مل گیا اور نتیجہ میں فریقین کے نہ چاہتے ہوئے بھی جنگ جمل واقع ہوگئی
لیکن اِس موقع پر حضرت حسنؓ کی فطانت اور حضرت معاویہؓ کے تدبر نے دشمن
کی ہر سازش کو ناکام بنا دیا نتیجہ کے طور پر وہی سبائی جو اپنے کو ''اہل بیت
رسالت'' کا سچا چاہنے والا ظاہر کرتے تھے اور حضرت حسنؓ کے ساتھ اپنی
وفاداری کی قسمیں کھاتے تھے حضرت حسنؓ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ اپنی
''مزعومہ امامت'' سے حضرت حسنؓ کی اولاد کو محروم کر دیا۔ اسی ذیل میں بنو ہاشم و
بنو امیہ کے خوشگوار تعلقات کا بھی ذکر آیا اور سبائیوں کی اس سازش کی بھی
نشاندہی کی گئی کہ وہ کس طرح پہلے بنو ہاشم سے اپنا تعلق جوڑ کر بنو امیہ کو مطعون
کرنے کی مہم میں لگے اور پھر بنو ہاشم میں بھی حضرت علیؓ اور ان کے بھائی عقیلؓ کو

الگ الگ خانوں میں بانٹا۔ یہی نہیں، بلکہ حضور علیہ السلام کی اولاد میں بھی
حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے ساتھ الگ الگ معاملہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ
حضرت حسینؓ کے بعد تمام ائمہ حضرت حسینؓ ہی کی اولاد سے نسلاً بعد نسلٍ مقرر
کئے گئے اور حضرت حسنؓ کی اولاد میں سے کسی کو بھی اس کا اہل نہیں قرار دیا گیا۔
اور آج بھی سبائیت کے علمبردار حضرت حسنؓ کا ذکر سرسری طور پر کر کے گذر
جاتے ہیں۔ جب کہ حضرت حسینؓ کے نام پر آہ و بکا، نالہ وشیون اور ماتم وسینہ
کوبی سب کچھ ہوتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں صرف ایک ہی بات نکھر کر سامنے آتی
ہے کہ سبائیوں کی طرف سے اسلام و پیغمبر اسلام اور اہلبیتؓ کا نام اپنی مطلب
برآری کے لئے لیا جاتا ہے تاکہ یہ مقدس غلاف ڈال کر اسلامی پیکر کو مسخ کیا
جاسکے۔ ورنہ اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو نہ ان کو اسلام سے محبت ہے نہ
پیغمبر اسلامؐ اور ان کے ساتھیوں سے نہ ہی اہل بیتؓ سے۔

تقریریں بہت ہی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنی گئیں اور رات کو ایک
بجے دوسرے دن ۱۰ر بجے دن منعقد ہونے والے سمینار کے اعلان کے ساتھ
اس بابرکت و بااثر جلسہ کا دعا پر اختتام ہوا۔

جلسہ میں جانے سے قبل قیام گاہ پر مقامی دینی درسگاہ مدرسہ مدینۃ
العلوم کے صدر مدرس اور دو دوسرے مدرسین صاحبان تشریف لائے تھے اور ان
سے وعدہ ہوا تھا کہ انشاء اللہ ہم لوگ صبح مدرسہ حاضر ہوں گے۔ چنانچہ ۱۳ر مارچ
۱۹۸۳ء کو صبح ۹ر بجے عبدالوہاب صاحب کے ساتھ (جو اسٹڈیز سینٹر کی طرح
اس مدرسہ کے بھی معتمد ہیں) ہم لوگوں نے مدرسہ حاضری دے کر علماء وطلباء و
دیگر اساتذہ سے ملاقاتیں کیں نیز مدرسہ کے بعض اساتذہ کی خواہش پر طلبہ و
اساتذہ کے سامنے علم دین کی فضیلت اور علماء دین کی ذمہ داریوں سے متعلق
قرآن وحدیث کی روشنی میں اختصار کے ساتھ کچھ گفتگو بھی کی۔

مدرسہ سے اٹھ کر ہم لوگ سیدھے اس مقام پر پہنچے جہاں سمینار کا انتظام

کیا گیا تھا۔ سیمینار کی حیثیت کی وضاحت پوسٹر، پمفلٹ اور اعلانات کے ذریعہ
پہلے ہی کی جا چکی تھی کہ اس میں جلسہ کے اصل موضوع سے متعلق مسلسل جھوٹے
پروپیگنڈے اور مسخ شدہ تاریخ کے مطالعہ سے جن لوگوں کے دلوں میں شکوک
وشبہات پیدا ہو گئے ہوں وہ مہذب انداز میں اپنے سوالات پیش کریں گے جن
کے جوابات دیئے جائیں گے۔

تقریباً ۱۱ر بجے دن میں سیمینار کے اصل موضوع کے پس منظر و پیش منظر کو
بیان کرتے ہوئے محترم محمد سالم سدوسی صاحب نے باقاعدہ سیمینار کا افتتاح کیا
اور عام استفسار کی دعوت دی۔ چنانچہ صلح حسن و معاویہ، خلافت معاویہ و یزید،
حادثہ کربلا، بنو ہاشم و بنو امیہ کے تعلقات اور خلافت بنو امیہ سے متعلق بہت سے
علمی و تحقیقی سوالات کیئے گئے جن کے جوابات سالم سدوسی صاحب اور راقم
الحروف دیتے رہے۔ الحمدللہ اس سیمینار یا مجلس مذاکرہ کے بہت خوشگوار اثرات
مرتب ہوئے اور ۲ر بجے دن کے قریب سیمینار کا اختتام ہوا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اب ہمارا کام ختم ہو چکا تھا اور ہم
لوگ واپسی کے لئے آزاد تھے مگر چوں کہ اسٹڈیز سینٹر کے اراکین نے ہم لوگوں
کی واپسی کا ریزرویشن سکندرآباد اور نئی دہلی کے درمیان چلنے والی تیز رو ٹرین
اے پی ایکسپریس سے ۱۵ر مارچ کا کرایا تھا جو سکندرآباد سے صبح ۶ر بجے روانہ
ہوتی ہے۔ اس لئے طے یہ پایا کہ ۱۳ر مارچ کا دن گذار کر رات میں بھی محبوب
نگر ہی میں قیام کیا جائے اور ۱۴ر کی صبح حیدرآباد واپسی ہو اور وہاں کے تاریخی
مقامات کی سیر کی جائے چنانچہ سیمینار کے اختتام پر یہ اعلان کر دیا گیا کہ چوں کہ
آج رات بھی راقم الحروف کا قیام محبوب نگر ہی میں رہے گا اس لئے جن
صاحبان کو موضوع بالا سے متعلق کوئی بات دریافت کرنا ہو وہ راقم الحروف سے
اس کی قیام گاہ پر بعد نماز عشاء ملاقات کر لیں۔

اسی روز بعد نماز مغرب محبوب نگر کے ایک با اخلاق اور مرنجان مرنج عامل

محمد خواجہ صاحب میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور گزشتہ شب کے پورے
پروگرام کے ریکارڈ کیئے ہوئے ۲ر کیسٹ انہوں نے پیش کیئے۔ خواجہ صاحب
کے اس تحفہ سے بہت خوشی ہوئی۔ اس طرح محبوب نگر کی خوشگوار یادوں کو تازہ
کر لینے کا موقع ملتا رہے گا۔ خواجہ صاحب محبوب نگر کے قیام کے دوران برابر
ملتے رہے اور ان کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ علم اور علماء کے بڑے قدر دان
ہیں۔ انہوں نے جمعہ کے دن دونوں وقت ہم لوگوں کو اپنے ہی گھر پر کھانا
کھلایا۔ دن میں تو خیر ہم دونوں بھائیوں کے علاوہ چند ہی لوگ اور بھی تھے لیکن
شام کو انہوں نے بڑی پر تکلف دعوت کی اور اس میں محبوب نگر کی کئی مسلم
وغیر مسلم معزز شخصیات کو بھی مدعو کیا۔

چوں کہ مقررہ پروگرام کے مطابق جلسہ اور سیمینار کی کارروائی مکمل ہو چکی
تھی اس لئے خیال یہ تھا کہ آج سونا جلدی ہو جائے گا مگر بعد نماز عشاء قیام گاہ
پر کافی تعداد میں لوگ آ گئے اور ایک غیر رسمی سیمینار پھر سے ہو گیا۔ اس وقت کی
مجلس چوں کہ بالکل بے تکلف اور غیر رسمی تھی اس لئے ان لوگوں نے بھی بہت
سے سوالات کیئے جو دن میں نہیں کر سکے تھے نیز سوال و جواب کے ساتھ ساتھ
تبادلہ خیال بھی ہوتا رہا۔ اس محفل کا اختتام رات کو ڈیڑھ بجے ہوا۔
منتظمین سے صبح واپسی کا پروگرام طے کرنے کے بعد ۲ر بجے کے بعد ہم
لوگ لیٹ کر سو گئے۔

۱۴ر مارچ ۱۹۸۳ء کو صبح بعد نماز فجر ہی اسٹڈیز سینٹر کے کئی ممبران آ گئے
جن سے الوداعی گفتگو ہوتی رہی۔ ناشتہ سے فراغت کے بعد ۹ر بجے کی بس
سے محبوب نگر کے سہ روزہ قیام کی خوشگوار اور ناقابل فراموش یادیں دل میں
بسائے ہم لوگ حیدرآباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ محبوب نگر کے بس اسٹیشن تک تو
بہت سے لوگ آئے لیکن ہم کو سکندرآباد سے رخصت کرنے کے لئے اسٹڈیز
سینٹر کے دو ممبر ایوب علی حبیب صاحب اور سید جہانگیر صاحب بس پر ہمارے

ساتھ سوار ہوئے۔عبدالوہاب صاحب بھی اپنی کسی ضرورت سے حیدرآباد آئے
تھے مگران کا ساتھ حیدرآباد اسٹیشن پر چھوٹ گیا۔اور ہم چاروں حیدرآباد سے
اس کے جڑواں شہر سکندرآباد کے لئے بذریعہ آٹو رکشہ روانہ ہوگئے۔پروگرام یہ
طے ہوا کہ چوں کہ اگلی صبح ہماری واپسی کی ٹرین سکندرآباد اسٹیشن سے روانہ ہوگی
اس لئے ہم کو رات میں سکندرآباد ہی میں قیام کرنا چاہیئے اور پہلے وہاں پہنچ کر
سامان رکھ دیا جائے اس کے بعد حیدرآباد کے کچھ تاریخی مقامات کی سیر کر لی
جائے۔چنانچہ پروگرام کے مطابق ہم لوگوں نے سکندرآباد اسٹیشن کے بالکل
قریب ایک ہوٹل کے کمرہ میں آکر سامان رکھا۔مجھے کچھ خواہش نہ تھی اس لئے
میں نے دوپہر میں کھانا نہیں کھایا اس کے عوض میں ہمارے دونوں معزز
میزبان عمدہ قسم کے بسکٹ لے آئے وہی کھائے۔بقیہ تینوں حضرات نے کھانا
کھایا اور نماز ظہر ادا کرنے کے بعد ہم لوگ پھر حیدرآباد آگئے تاکہ حیدرآباد کی
چند چیدہ تاریخی چیزوں کو دیکھ سکیں۔

سب سے پہلے ہم لوگ حیدرآباد کی مشہور تاریخی عمارت چار مینار دیکھنے
پہنچے یہ پرشکوہ عمارت ابھی بہت اچھی حالت میں ہے اور ہماری لکھنؤ کی تاریخی
عمارتوں کی طرح بوسیدہ وخستہ حال نہیں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محکمہ آثار
قدیمہ کی طرف سے اچھی نگہ داشت کی جاتی ہے پھر ہم لوگ چار مینار سے قریب
ہی مکہ مسجد کی زیارت کے لئے گئے۔یہ بڑی خوبصورت وسیع اور تاریخی اہمیت
کی حامل مسجد ہے۔چار مینار، مکہ مسجد اور اسی طرح دوسری تاریخی عمارتوں میں
عموماً پیشہ ور گائڈ ہوتے ہیں۔یہ گائیڈ کیسی کیسی تحقیقات پیش کرتے ہیں اس کا
ایک نمونہ مکہ مسجد میں سامنے آیا کہ جب ہم لوگ واپس آرہے تھے تو ایک گائیڈ
صاحب ایک جماعت کو لے کر مسجد جارہے تھے اور مسجد کے بارے میں کچھ تلگو
زبان میں کہہ رہے تھے میں نے اپنے ساتھی حبیب صاحب سے دریافت کیا تو
انہوں نے بتایا کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ہندوستان کی سب سے پہلی اور دنیا کی

تیسری سب سے اہم تاریخی مسجد ہے۔میں نے سوچا ممکن ہے کہ مسلسل کہتے
رہنے سے کچھ دن کے بعد اسے تاریخی حقیقت کی حیثیت سے تسلیم بھی کیا جانے
لگے۔اسی طرح تو تاریخ مسخ کی جاتی ہے۔

مکہ مسجد سے سالار جنگ میوزیم آئے اس میوزیم میں ایک سے ایک
پرکشش چیز نظر آئی۔پتھر پر کئے جانے والے دکنی کام کے نمونے، لکڑی پر کئے
جانے والے کشمیری جاپانی اور چینی کام کے نمونے، بلجیم اور چین کے چینی کے
برتنوں پر کئے جانے والے کام کے نمونے وغیرہ۔یہاں ایک بہت خاص قسم کی
گھڑی بھی نظر آئی۔اس گھڑی کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر گھنٹہ پورا ہونے کے
قریب اس کے اندر کی ایک کھڑکی کھلتی ہے اور اس میں سے ایک پتلا دربانوں
والا لباس پہنے اور گھنٹہ ہاتھ میں لئے نمودار ہوتا ہے اور جیسے ہی بڑی سوئی ۱۲ر پر
پہنچتی ہے یہ دربان اتنے ہی گھنٹے بجا دیتا ہے جتنا وقت ہوتا ہے۔گھنٹے بجانے
کے بعد تیزی کے ساتھ وہ پھر اسی گھڑی میں واپس چلا جاتا ہے۔اور کھڑکی بند
ہوجاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس گھڑی اور اسی جیسی تمام پرکشش چیزوں کے بنانے
والے انسان ہی رہے ہوں گے مگر آج ان کا نام ونشان مٹ چکا ہے۔ان کی
مصنوعات آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جارہی ہیں لیکن خود ان کا نام لیوا کوئی
نہیں ہے۔ ع رہے نام اللہ کا

حیدآباد اور محبوب نگر میں ایک چیز بڑی مسرت بخش نظر آئی کہ ابھی ان
جگہوں سے سرکاری سطح پر اردو زبان کو اس طرح نکالا نہیں ملا ہے جس طرح اسے
اس کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش سے مل چکا ہے۔چنانچہ سرکاری دفاتر
کے بورڈوں پر انگریزی اور تلگو کے ساتھ ساتھ نہ صرف اردو بلکہ عربی آمیز اردو
بھی لکھی نظر آئی مثلاً میونسپلٹی کے بورڈ پر ”بلدیہ“ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس
کے بورڈ پر ”ضلع مہتمم تعلیمات“ اسمبلی کے صدر دروازہ کے قریب لگے ہوئے

بورڈ پر ''معتمد مقننہ'' لکھا دیکھ کر حیرت آمیز خوشی کا احساس ہوا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ آندھرا پردیش کی موجودہ حکمراں جماعت ''تلگو دیسم'' نے صرف علاقائیت اور علاقائی زبان کی بنیاد پر ہی الیکشن میں حصہ لے کر حیرت ناک کامیابی حاصل کی ہے اور اس پارٹی نے اپنے قیام کے صرف ۹/ ماہ کے اندر ریاست کے عام الیکشن میں حصہ لے کر آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کانگریس پارٹی کو زبردست ہزیمت دے کر کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اور اب اقتدار حاصل کر لینے کے بعد تلگو زبان کو فروغ دینے میں خصوصی دلچسپی لے رہی ہے مگر ایسا احساس ہوتا ہے کہ حکمراں جماعت اردو کو تلگو کا حریف نہیں سمجھتی ہے جیسا کہ اتر پردیش میں اردو اور ہندی کو ایک دوسرے کا حریف سمجھنے کی غلطی کی جا رہی ہے۔

مغرب کے وقت تک ہم لوگ حیدرآباد ہی میں رہے نماز مغرب مسجد عامرہ میں ادا کی۔ پھر ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد سکندرآباد واپس آ گئے اور نماز عشاء ادا کرنے اور کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد سو گئے۔

۱۵/ مارچ کو صبح ساڑھے چار بجے آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر پہلے ہم لوگوں نے نماز فجر ہوٹل کے کمرہ ہی میں ادا کی اس کے بعد اسٹیشن آ گئے۔ حبیب صاحب اور جہانگیر صاحب بھی ساتھ ساتھ آئے۔ ان دونوں حضرات نے رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ اور ہر طرح آرام پہنچایا۔ اللہ پاک جزائے خیر عطا فرمائے۔

ٹرین ٹھیک ۶/ بجے صبح سکندرآباد اسٹیشن سے روانہ ہوگئی اور جھانسی سے پسنجر ٹرین بھی مل گئی۔ یہ دونوں ہی ٹرینیں ہندوستانی ریلوے کے روایتی ''حسن انتظام'' کے مطابق لیٹ ہوئیں مگر اتنی نہیں کہ اس کا باقاعدہ ذکر کیا جائے۔ صرف ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے ۱۶/ مارچ ۱۹۸۳ء کو دن میں ۱۲:۳۰/ بجے ہم لوگ بعافیت تمام لکھنؤ پہنچ گئے اور اتنی تاخیر کے تو ہم ہندوستانی لوگ عادی بھی ہو چکے ہیں اور اسے تاخیر سمجھنا بھی چھوڑ چکے ہیں۔

ایک بھولا بسرا سفر

میں نے سفرنامے لکھنے کا کبھی اہتمام نہیں کیا۔ زندگی میں سفر تو بہت ہوئے، لیکن کسی خاص مناسبت سے کبھی کبھار ہی یہ تحریک ہوئی کہ اس سفر کی روداد لکھی جائے۔ پھر ارتجالاً جو کچھ بنا لکھ لکھا کر اپنے رسالہ ''البدر'' میں شائع کرا دیا —— کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ باذوق قارئین کو کوئی سفرنامہ پسند آیا تو انہوں نے ازراہ محبت اس کا تقاضا کیا کہ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ مگر میرے لاابالی پن نے اس ''مخلصانہ مشورہ یا تقاضے'' کو پورا نہیں ہونے دیا، اور ''البدر'' کی کم و بیش ۴۴/ سالہ مدت عمر میں چند سفرناموں ہی کی اشاعت ہوئی —— حالاں کہ اس دوران ملک و بیرون ملک کے کئی ایسے سفر بھی ہوئے جن کے بارے میں از خود یا کسی کی توجہ دہانی پر بعد میں احساس ہوا کہ اس سفر کی روداد لکھنا اور شائع ہونا چاہئے تھا، لیکن جب یہ احساس جاگا تو اتنی تاخیر ہو چکی تھی کہ نہ ذہن میں تفصیلات محفوظ تھیں نہ ہی ''حسب عادت'' کہیں لکھا پڑھا تھا؟۔

اب جب کہ ''وبائی مرض کرونا کی جبری پابندیوں'' کی وجہ سے عام معمولات زندگی معطل ہیں تو حق تعالیٰ نے اس شر سے اپنے فضل سے میرے لئے یہ خیر پیدا فرما دیا ہے کہ کچھ لکھنے لکھانے کا زیادہ موقع میسر ہے، اور اپنے شوق کی کسی نہ کسی درجہ میں تکمیل بھی ہو رہی ہے —— اسی سلسلہ تحریر میں یہ خیال آیا کہ میرے مطبوعہ سفرناموں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کی باقاعدہ کتابی شکل میں اشاعت دوسروں کے لئے بھی نفع بخش ہو سکتی ہے۔ میرے اس خیال

کی میرے فرزند اصغر مولوی معاویہ عبدالرحیم ندوی سلّمہٗ نے بھرپور تائید کرتے ہوئے اپنے اصرار کے ذریعہ مجھے اس بات پر آمادہ کرلیا کہ ''البدر'' میں شائع شدہ ایسے سفرناموں پر نظرثانی اوراس میں ضروری حذف واضافے کرکے، نیز جتنا اور جس طرح بن پڑے کچھ پچھلے اسفار کی اپنی یادداشت سے روداد سفر لکھ کر نئی ترتیب سے کتابی شکل میں ان کی اشاعت کروں تو ایک دلچسپ اور تجربوں سے بھرپور ایسا سفر بھی یاد آیا جس کی ''ضروری سفری تفصیلات'' حتیٰ کہ مرکز سفر کا صحیح نام تک ذہن میں محفوظ نہیں ہے —— اور ایسی یادداشتوں کی ڈائری تو کبھی لکھی ہی نہیں؟ —— پھر بھی چند دلچسپ یاد رہ جانے والی باتوں کی وجہ سے طبیعت کا شدید تقاضا ہے کہ اس سفر کی روداد بھی اس زیر ترتیب کتاب میں ضرور شامل ہونا چاہیئے۔ اب دیکھئے یہ تقاضا کیا گل کھلاتا ہے؟ لکھنے کی ہمت تو یہ سوچ کر کر ہی لی ہے کہ ؂

انجام اس کے ہاتھ ہے آغاز کرکے دیکھ
بھیگے ہوئے پروں ہی سے پرواز کرکے دیکھ

کم وبیش ۳۵/برس قبل کرناٹک کے ضلع منگلور کے لئے ہونے والا یہ دینی ودعوتی سفر بمبئی میں مقیم ان میڈیکل وانجینئرنگ وغیرہ جیسی عصری تعلیم کے نوجوان طلبہ کی دعوت واصرار پر ہوا تھا جو ان دنوں وہاں میرے ہونے والے تقریری جلسوں میں کئی برس سے بڑی دلچسپی و پابندی کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔ ہر سال ماہ محرم میں بارہ روز تک ایک ہی مقام پیرولین، پٹھان باڑی (بھنڈی بازار) اوراس کے علاوہ کبھی کبھی ہفتہ عشرہ تک دیگر مقامات پر ہونے والی تقریروں میں ضلع منگلور کے یہ چند ساتھی طلبہ نہ صرف میری تقریروں میں دلچسپی رکھتے تھے، بلکہ میرے قیام بمبئی کے دوران دن میں بھی وقت لے کر کبھی کبھی آتے اور دیر تک اپنے علاقہ کی جہالت اور مسلمانوں کے عقائد میں بگاڑ کے حوالے دے کر مجھ سے چند دنوں کے لئے وہاں چلنے اور دین

وایمان کی حقیقی و سچی باتیں بیان کرنے کے لئے اصرار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں میں میری قدر ومحبت کچھ اس طرح ڈال دی تھی کہ ان کا یہ ماننا تھا کہ میرے بیانات نیز نجی مجلسی باتوں کا ان شاءاللہ بہت خوشگوار اثر ہوگا۔ ع

یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا

بمبئی سے ان کا وطنی گاؤں جس کا نام غالباً ''کریم الدین کمبل'' تھا کئی سو کلومیٹر کی دوری پر تھا، جہاں کے لئے مستقل سفر کی ضرورت تھی، اورسب سے آسان وآرام دہ ذریعہ سفر لگژری بسوں کا تھا جن میں سفر کے لئے کئی دن پہلے سے ریزرویشن کرانا ہوتا تھا —— میری مجبوری یہ تھی کہ عام طور پر بمبئی ہی میں ہر سال میرے اپنے پہلے سے طے شدہ پروگرام سے زیادہ وقت لگ جایا کرتا تھا۔ اس لئے کئی برس تک ان نوجوانوں کے مخلصانہ بلکہ والہانہ تقاضے کو پورا نہ کرسکنے کے بعد بالآخر یہ طے پایا کہ چند ماہ کے بعد صرف ان کے تقاضے کی تکمیل کے لئے میں لکھنؤ سے بمبئی کا سفر کروں، اور پھر بمبئی سے ان لوگوں کے ساتھ ان کے وطن کا سفر کروں۔ چنانچہ مقررہ تاریخ پر میں اپنے چھوٹے بھائی مولوی عبدالولی فاروقی کے ہمراہ لکھنؤ سے بذریعہ ریل بمبئی پہنچ گیا جہاں ہمارے ان داعی نوجوانوں نے پلیٹ فارم ہی پر ہمارا پرتپاک استقبال کیا اور اپنے ہم راہ ہمارے ہوٹل کی قیام گاہ لے گئے۔ پھر دوسرے دن رات کے وقت ہم کئی لوگوں کی (جن کی صحیح تعداد اور بس کی منزل کا نام بھی اب یاد نہیں رہ گیا ہے) اسی لگژری بس سے روانگی ہوئی جس میں پہلے سے ریزرویشن تھا۔ رات بھر کے سفر کے بعد دوسرے دن (غالباً منگلور شہر) بس اسٹیشن، اور پھر وہاں سے ان کے گاؤں کریم الدین کمبل (؟) پہنچے۔ پورے راستے میں ان پرجوش و مہذب نوجوانوں نے ہمیں کھلانے پلانے اور آرام وراحت فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

قیام گاہ پر پہنچتے ہی خاطر مدارات اور مقامی حضرات کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔کم وبیش ایک ہفتہ قیام کے دوران ان نوجوانوں اوران کے گھر والوں نے کھلانے پلانے اوراعزاز واکرام میں کوئی دقیقہ اٹھانہیں رکھا۔ اس دوران ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہوا کہ کھانے میں انواع واقسام کے دال سالن کے ساتھ صرف چاول آتے تھے۔گیہوں کی روٹی کا کوئی ذکر بھی نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے رنگارنگ ملک کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے۔بیشتر علاقے کے لوگ صرف چاول خور ہیں،ان کے یہاں نہ گیہوں کی پیداوار ہوتی ہے نہ ہی وہ گیہوں اور اس کی روٹی کھاتے ہیں۔اسی طرح بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں گیہوں اور چاول دونوں کھائے جاتے ہیں مگر اس طرح کہ ایک وقت کے کھانے میں صرف چاول، اور دوسرے وقت میں صرف روٹی۔ جب کہ ہم لوگ دونوں وقت کے کھانے میں گیہوں کی روٹی اور چاول دونوں چیزیں کھانے کے عادی ہیں۔ یہ رنگارنگی صرف ہمارے ہی ملک میں پائی جاتی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس ملک میں ہر بارہ کوس کے بعد کچھ نہ کچھ زبان وتہذیب اور کھان پان میں تبدیلی ہوجایا کرتی ہے ——— پھر کرناٹک کا وہ علاقہ تو ہمارے وطن لکھنؤ سے سیکڑوں کلومیٹر دور تھا۔ وہاں گیہوں اور گیہوں کی روٹی کھانے کا اس وقت کوئی چلن نہیں تھا؟۔

ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ ایک دو وقت جب صرف چاول کھانا پڑا تو ظاہر ہے کہ شکم سیر ہوکرنہیں کھا پارہے تھے اوراس سلسلہ میں لحاظاً کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔مگر ہمارے میزبانوں نے یہ محسوس کرکے کہ کچھ رک رک کر اور کچھ کم کم کھارہے ہیں، خود ہی پوچھ لیا کہ کیا بات ہے کیا ہم لوگوں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آرہا ہے؟۔کوئی کمی ہوتو بتادیجئے ——— ہم نے پہلے تو ٹالنے کی کوشش کی، لیکن ان کے اصرار پر جھجکتے جھجکتے میں نے کہا کہ کھانے میں کوئی کمی نہیں ہے، ماشاء اللہ آپ لوگ ایک سے ایک عمدہ چیزیں کھلا رہے ہیں۔مگر ہم لوگوں کی

بگڑی عادت یہ ہے کہ ہم دونوں وقت روٹی اور چاول دونوں ہی کھاتے ہیں۔ اگر اتفاقاً کسی وقت صرف روٹی ہوتو کام چل جاتا ہے، لیکن صرف چاول سے پیٹ نہیں بھرتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ ان لوگوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے بہت ہی خوش دلی کے ساتھ کہا یہ کون سی بڑی بات ہے؟۔روٹی تو ہم لوگ بھی کھاتے ہیں۔آپ نے تکلف سے کام لیا، ورنہ دونوں چیزوں کا آسانی کے ساتھ انتظام ہوجاتا ——— اور پھر اگلے وقت واقعی چاول کے ساتھ روٹی بھی آئی، مگر وہ روٹی گیہوں کی نہیں بلکہ چاول سے بنی ہوئی تھی۔ یہ روٹی واقعی بہت لذیذ تھی مگر گیہوں کی تو نہیں تھی؟۔اس کے بعد یہ ہوا کہ ہماری پوری مدت قیام کے دوران چاول سے بنی ہوئی طرح طرح کی روٹیاں آتی رہیں اور ہم مزے لے لے کر کھاتے رہے، مگر گیہوں کی روٹی کھانا تو دور، اس کی زیارت بھی نہ ہوسکی ——— اور ہم نے کسی طرح اپنے مخلص میزبانوں کو اس کا احساس نہیں ہونے دیا کہ ہماری طلب ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ ہمارا یہ سفر ایک مخصوص پس منظر میں دینی و دعوتی تھا۔جس کے لئے ترتیب یہ بنائی گئی کہ رات کو مختلف مقامات پر عوامی جلسے ہوتے، اور دن کے وقت مخصوص لوگوں خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ساتھ خصوصی نشستیں ہوتیں جس میں بے تکلف گفتگو بھی ہوتی اور سوال جواب کے مواقع بھی فراہم کئے جاتے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ رات کے عوامی جلسوں سے زیادہ دن کی ان خصوصی نشستوں سے نفع ہوا۔کیوں کہ ان میں سننے اور سنانے والوں کو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوکر بات کرنے اور شکوک وشبہات کے ازالہ کے مواقع ملتے تھے۔کبھی کبھی ہلکی پھلکی بحث بھی ہوجاتی تھی جس کا نتیجہ خوش گوار نکلتا، اور اس کے ذریعہ قلبی اطمینان حاصل ہوتا؟۔ جیسا کہ ہمارے اس سفر کے اصل داعی ومحرک نوجوانوں نے بتایا تھا کہ اس علاقہ کا اصل مسئلہ صحیح دینی تعلیم وتربیت نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا بدعات وخرافات اور

غیر شرعی وغیر اخلاقی مراسم میں مبتلا ہونے کے ساتھ عقائد میں فساد و بگاڑ کا تھا۔ جس سے ہمارے یہ تعلیم یافتہ نوجوان کڑھتے تھے اور اپنی دینی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اصلاح کے لئے فکر مند تھے۔

اس علاقہ پر اس وقت کے بریلویوں کے مشہور عالم مولوی ارشد القادری کی بڑی مضبوط گرفت تھی، اور ان کا وہاں برابر آنا جانا لگا رہتا تھا جس کی وجہ سے وہاں کے عوام ان سے اور ان کی تقریروں سے بہت مانوس تھے —— ان کی تقریروں میں کیا مواد ہوتا تھا؟۔ اس کی تفصیلات بیان کر کے ہم اپنے اس سفر کی خوش گوار روداد کو نزاعی اور بوجھل بنانا مناسب نہیں سمجھتے —— پھر یوں بھی موصوف اب ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، اس لئے ان کی ''ذاتیات'' کو موضوع گفتگو بنانا دینی اور اخلاقی کسی بھی لحاظ سے روا نہیں ہے۔

میں اس روداد سفر میں موصوف کا ذکر بھی نہ کرتا، مگر وہاں آڈیو کیسٹ کے ذریعہ سنی ہوئی ان کی ایک تقریر کا انداز بیان، خصوصاً ایک معروف دینی جماعت پر ان کے ''منفی تبصرہ'' کا انداز بیان اتنا دلچسپ تھا کہ اس وقت بھی میں نے اسے گھما گھما کر کئی مرتبہ سنا تھا۔ اور طویل عرصہ گذر جانے کے بعد آج بھی جب اس کی یاد آ جاتی ہے تو یہ سوچ کر ایک گدگدی سی پیدا ہو جاتی ہے کہ ع

ذہن کیا کیا واہمے تخلیق کرتا ہے؟

اگرچہ وہ تبصرہ دین، دینی جماعتوں، اور دینی افراد سے تعلق رکھنے والے تمام باغیرت وسنجیدہ مسلمانوں کی طرح میرے لئے بھی ناقابل قبول ہے —— تاہم ''مولویانہ چالوں'' کی ایک جھلک اور صحیح کو غلط بنا کر پیش کرنے کی ماہرانہ تکنیک کے ایک نمونہ کے طور پر اسے پیش کرنا دلچسپی، اور پھر عبرت سے خالی نہیں ہے۔

موصوف نے ''تبلیغی جماعت'' کو نشانہ پر لیتے ہوئے اس پر کچھ یوں تبصرہ کیا تھا کہ:

''بچپن میں ہمیں دوپہر کے وقت گھروں سے باہر نکلنے کے لئے سختی کے ساتھ منع کیا جاتا تھا، ہماری نانیاں دادیاں ہمیں بہلا پھسلا کر اپنے پاس سلانے کے لئے کہتیں کہ دوپہر کے وقت بلائیں نکلتی ہیں، تم باہر جاؤ گے تو بلائیں تمہیں پکڑ لیں گی —— اب آج کل ان بلاؤں نے اپنے نکلنے اور چلتے راہ گیروں کو پکڑنے کا وقت تبدیل کر دیا ہے، اب یہ بلائیں سہ پہر کو بعد نماز عصر نکلتی ہیں اور اپنے نکلنے کو ''گشت'' کا نام دیتی ہیں۔ ان بلاؤں سے ہوشیار رہنا، انہیں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر دور ہی سے دھتکار دینا۔ ورنہ یہ تم سے چمٹ کر تمہارے دین وایمان کو لوٹ لیں گی —— سمجھ تو گئے ہوگے یہ بلائیں کون ہیں؟۔ یہ ہیں ''بستر اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمٹیڈ'' کے لوگ، جو اپنے کاندھوں پر اپنے بستر لادے ہوئے تبلیغ کے نام سے ایمان اور ایمان والوں کی محبت کو لوٹنے کے لئے ''بڑے بھائی کا کرتہ اور چھوٹے بھائی کی شلوار'' پہن کر، ہاتھوں میں تسبیح اور منہ میں مسواک ٹھونسے ہوئے نکلتے ہیں۔ دعوت مسجد میں آنے کی دیتے ہیں اور مسجد میں آ جانے والوں کو دنیا بھر میں سیر سپاٹے کرنے کے لئے بھرتی کرتے ہیں، ہنستے ہوئے بھی رونے جیسی شکل بنا کر اپنے کو خوش اخلاق اور سچا پکا مومن ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں —— ان کے مکر وفریب سے ہمیشہ ہوشیار رہنا، ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اپنے دین وایمان کا بیڑہ نہ غرق کر لینا۔ وغیرہ وغیرہ............''

اس تحریر کو پڑھنے والوں میں یقیناً کچھ ایسے ضرور ہوں گے جن کو اس ''منفی تبصرہ'' نے کبیدہ خاطر کر دیا ہوگا —— ایسے لوگوں کو میرا مشورہ ہے کہ

"اس قسم کے لطیفوں" کو سنجیدگی سے نہیں لینا چاہئے۔ لطیفہ تو بس لطیفہ ہی ہوتا ہے۔ بیان کرنے والے کا انداز بیان خود ہی بتارہا ہے کہ وہ کوئی ٹھوس علمی و اصلاحی گفتگو نہ کرکے اپنے سامعین کو لطیفے اور چٹکلے سنا کر بس ان کی واہ واہی حاصل کرنا چاہتا ہے؟۔ تو پھر کسی سننے یا پڑھنے والے کو کڑھنے اور اپنا خون جلانے کی کیا ضرورت ہے؟۔

صوبہ کرناٹک کا یہ دیہی علاقہ نہایت سرسبز وشاداب ہے، یہاں کے لوگوں کی اپنی مادری زبان تو غالباً کنڑ ہے، لیکن اردو کا سکہ پورے ملک کی طرح یہاں بھی پوری طرح رواں دواں ہے۔ دیہات کے لوگوں خصوصاً ایسے لوگوں کو جن کا باہر آنا جانا بہت کم ہے اردو بولنے میں تو کچھ دقت ہوتی ہے، اور وہ سوچ کر، اٹک اٹک کر ہی بول پاتے ہیں، لیکن سمجھنے میں کسی کو دقت نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ میری تقریروں سے لے کر عام بول چال اردو زبان ہی میں ہوتی رہی مگر مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا کہ میری بات سمجھنے میں کسی کو کوئی دشواری ہورہی ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو گھٹ رہی ہے، اردو مٹ رہی ہے، اور اردو کا مستقبل تاریک ہے —— مگر میرا تو کہنا ہے کہ "اردو تہذیب" کے تعلق سے تو اس بات میں وزن ہے۔ اور واقعی اردو والوں کی بے توجہی یا واضح الفاظ میں خودغرضی کی وجہ سے "اردو تہذیب" تو مائل بہ زوال ہے۔ لیکن اردو زبان نہ گھٹ رہی ہے، نہ مٹ رہی ہے، نہ ہی اسے مستقبل میں ایسا کوئی خطرہ ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ کوئی تسلیم کرے یا انکار کرے، حقیقت یہی ہے کہ ہمارے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک رابطہ کی زبان اردو اور صرف اردو ہی ہے۔ حتیٰ کہ یہ مقام ہماری قومی زبان ہندی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ رنگا رنگ تہذیبوں اور زبانوں کے حامل ہمارے اس عظیم ملک میں باقی جتنی بھی زبانیں ہیں وہ سب علاقائی ہیں۔ لیکن اردو زبان کا معاملہ سب سے الگ ہے۔ وہ ہر علاقے میں سمجھی بھی جاتی ہے اور سب کے لئے قابل قبول بھی

ہے —— بھلے ہی اردو نظم کو گیت، اور اردو مکالموں کو ہندی کا نام دیا جانے لگا ہو؟؟۔

ہمارے عظیم اور رنگارنگ ملک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہم ضروریات زندگی کی کسی بھی چیز کے سلسلہ میں کسی دوسرے ملک کے محتاج نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو اپنی بے شمار نعمتوں سے اس طرح نوازا ہے کہ وہ دنیا کے دیگر ممالک کے لئے قابل رشک ہے —— ہاں اگر "بھیک مانگنے" کی لت ہی لگ گئی پھر شاہی محل میں رہنے والی بھکارن کو شاہی محل کا عیش وعشرت بھی اپنی بھیک مانگنے کی لت پوری کئے بغیر راس نہیں آتا؟۔

کرناٹک کا یہ علاقہ جہاں ہمارا چند روزہ قیام ہوا، ناریل کے باغات سے مالامال ہے۔ چنانچہ ہمارے میزبان صاحبان ہمیں ناریل کے ایک باغ کی سیر کرانے لے گئے، اور پھر ہم نے وہاں بیٹھ کر کچے اور پکے ناریل کے پھل کے مختلف ذائقوں کا لطف اٹھایا جن کا ہم اپنے علاقہ میں تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ سب سے زیادہ لذیذ ناریل کی وہ بالائی تھی جسے ہم نے پھل کے اندر سے چمچے کے ذریعہ نکال کر کھایا تھا۔ وہاں کے ناریل پانی اور ناریل گری کا ذائقہ بھی ناقابل فراموش ہے۔ جس طرح سوپور (کشمیر) کے باغ میں جاکر مختلف قسم کے سیبوں کے کھانے کا اپنا الگ مزہ آیا تھا، اسی طرح ناریل کے ایک پھل کو اپنے یہاں کے امرود کی طرح مختلف ذائقوں کے ساتھ کھا کر لطف اٹھایا۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی توفیق ملی۔

چوں کہ میں نے اس دینی ودعوتی سفر کے دوران اپنے خطابات اور مجلسی گفتگوؤں میں مثبت انداز اپنایا تھا اور کسی کا نام لئے اور طنز وتعریض کئے بغیر سادہ اور آسان انداز بیان میں خالص دین کی بات پیش کرنے اور اَلدِّیْنُ یُسْرٌ (دین آسان ہے) کی تشریح کی کوشش کی تھی، اس لئے بفضلہٖ تعالیٰ میرا یہ سفر اپنے مقصد کے لحاظ سے بہت کامیاب رہا تھا۔ اور میں اپنے ان دین پسند

نوجوانوں کے سامنے سرخ رو رہا تھا جو مجھے بڑے اہتمام کے ساتھ اور مجھ سے بڑی توقعات وابستہ کرکے اپنے علاقہ میں لے گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے خصوصی کرم اور ان نوجوانوں کے اخلاص کی برکت سے ہوا تھا ورنہ ع

من آنم کہ من دانم

چھ روز قیام کے بعد ہماری اسی طرح اپنے ان قدرداں نوجوانوں کے ساتھ بذریعہ بس بمبئی تک، اور پھر وہاں سے لکھنؤ ٹرین سے واپسی ہوئی۔

اس سفر کے بعد عرصہ دراز تک ہمارے وہ داعی نوجوان رابطہ میں رہے، بمبئی میں ان سے کافی خوش گوار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور وہ لوگ میرے اس دینی ودعوتی سفر کی کامیابی، اور گاؤں والوں کے یاد کرنے کے حوالے دے کر پھر اس علاقہ کے سفر کے لئے اصرار کرتے رہے۔ اور میں سفر کے لئے وعدے بھی کرتا رہا، مگر پھر دوبارہ وہاں جانا نہیں ہوسکا۔ ۱۹۹۵ء کے بعد میرا اپنے طویل قیام کے لئے ۱۹۹۴ء میں والد ماجدؒ کی وفات کے بعد کچھ اضافی مشغولیات وذمہ داریوں کی وجہ سے بمبئی جانے کا سلسلہ بھی موقوف ہوگیا۔ اور پھر ان نوجوانوں سے رابطہ بھی ختم ہوگیا۔ اللہ کرے وہ اپنی دینی فکر کے ساتھ اور اپنی دنیاوی زندگیوں میں بھرپور کامیابی کے ساتھ سلامت ہوں۔ اب تو وہ نوجوان کیا، ادھیڑ عمر کے معتبر قسم کے بال بچوں دار لوگ ہوں گے؟۔ مگر دعا یہ ہے کہ ان کی دینی فکر اب بھی جوان ہو —— یعنی اردو کے مقبول شاعر خمار بارہ بنکوی کے الفاظ میں ؎

دعا یہ ہے گمراہ نہ ہوں ہم سفر اپنے
خمار میں نے تو اپنا سفر تمام کیا

☆☆☆

گلزاروں کی وادی میں ۶/دن

کشمیر کا سفر دو برس پہلے ۱۹۹۷ء میں بھی ہوا تھا مگر اسے بس ''سفر'' ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ ایک مخلص دوست اور رفیق درس جناب مولانا غلام قادر صاحب مہتمم مدرسہ ضیاء العلوم پونچھ (کشمیر) نے اپنے مدرسہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے بڑے اہتمام کے ساتھ دعوت دی تھی، سفر ہوا اور جلسہ میں شرکت بھی ہوئی مگر اس طرح کہ آنے جانے کے سفر میں جتنا وقت لگا اس کا ایک چوتھائی وقت بھی کشمیر میں نہیں گذر سکا تھا —— بس ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کشمیر جانا ہوا تھا۔

پھر یوں بھی وہ سفر کشمیر کا ضرور تھا مگر ''وادی کشمیر'' کا نہیں جب کہ گلزاروں، مرغزاروں، چشموں، جھیلوں، دریاؤں، آبشاروں، اونچی اونچی پہاڑیوں، تعمیری شاہکاروں اور حسین قدرتی مناظر کا اصل کشمیر تو وادی ہی میں ہے۔

۳/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو شروع ہوکر ۱۱/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ختم ہونے والے اس حالیہ سفر میں اگرچہ وادی کے اندر ۶/دن گذرے مگر وہ جسے ''سیروسیاحت'' کہا جاتا ہے، اس کا موقع پھر بھی نہ مل سکا —— اگرچہ کشمیر پہنچ کر بھی شالیمار، نشاط باغ، پہلگام اور گلمرگ نہیں دیکھ سکا لیکن دل خوش ہے کہ کشمیریوں کی بے لوث محبت دیکھی، بہترین انتظام کے ساتھ قائم ہونے والے مدارس دینیہ دیکھے، باعمل دینی شخصیات کی زیارت ہوئی۔ قال اللہ وقال الرسول کی دلنواز صدائیں

سنیں، ذکراللہ کی مجلسوں میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ پھر جاتے آتے بلا
ارادہ ہی سہی وہ کشمیر تو اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لیا جس کا تصوراتی خاکہ ہی ذہن
میں بنتا بگڑتا رہتا تھا ـــــ اور ہاں بالارادہ سرینگر کی عظیم جامع مسجد پہنچ کر
نماز عصر ادا کرلی، حضرت بل کی تاریخی درگاہ کو دیکھ لیا، ڈل جھیل اور خیار کے پیڑ
بھی دیکھ لئے، اور دریائے جہلم میں کشتی کے ذریعہ سیر بھی کرلی ـــــ اس
طرح کہہ سکتا ہوں کہ پورا نہیں تو بہت کچھ کشمیر تو دیکھ ہی لیا۔

کشمیر کا سفر بہت عجلت میں اس طرح ہوگیا کہ ستمبر ۱۹۹۹ء کے آخری عشرہ
کی کسی تاریخ میں میرے مخلص اور عزیز شاگرد جناب مولانا خورشید انور صاحب
کا جموں سے فون آیا اور انہوں نے دارالعلوم سوپور کے مہتمم جناب مولانا
بشیر الدین قاسمی صاحب کی طرف سے نہ صرف کشمیر کے سفر کی دعوت دی بلکہ
اصرار کے ساتھ سفارش بھی کی کہ متعدد مدرسوں اور دینی مراکز کی طرف سے
ہونے والے دینی واصلاحی جلسوں میں شرکت کیلئے یہ سفر ضرور کرلوں ـــــ
''جنت ارضی'' کے نام سے یاد کئے جانے والے اس خطہ کو دیکھنے اور برتنے و
پرکھنے کا موقع دینی دعوت کے طفیل میں مل رہا تھا، پھر بھلا اسے آسانی کے ساتھ
کیوں کر نظر انداز کیا جاسکتا تھا؟

بالآخر عزیز موصوف کے دوبارہ رابطہ قائم کرنے پر ان کو یہ نظام بتادیا کہ
۳/اکتوبر کو ان شاءاللہ لکھنؤ سے جموں کے لئے روانگی ہوگی اور طویل مدتی قیام
کے اصرار کے باوجود اپنے اعذار بیان کرکے ان کی طرف سے اس کی منظوری
بھی حاصل کرلی کہ لکھنؤ واپسی ۱۱/اکتوبر کو ہوجائے گی، یہ تو علم تھا کہ ۳/اکتوبر کو
لکھنؤ کا پارلیمنٹری الیکشن ہے جہاں سے ملک کے وزیر اعظم جناب اٹل بہاری
باجپئی بھی الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں لیکن اس کا دور دور تک خیال نہ تھا کہ
اس ''الیکشن کی برکت'' سے لکھنؤ جیسے شہر کا یہ حال ہوگا کہ گھر سے اسٹیشن تک پہنچنے
کے لئے کوئی سواری نہ مل سکے گی اور جگہ جگہ ''پولیس کے جوان'' کھڑے ہوکر

سائیکل اور اسکوٹر سواروں تک کو واپس جانے پر مجبور کریں گے، وہ تو کہئے کہ
انڈین ریلوے کی ''قدیم روایت'' ہمارے لئے باعث رحمت بن گئی کہ ایک
گھنٹہ کا اعلان کرکے ٹرین واقعتاً تین گھنٹے تاخیر سے آئی اور اس سے بہت پہلے
ہی میں اور میرے رفیق سفر عزیز مولوی حافظ عبدالمعبود فاروقی سلّمہٗ گھر سے
اسٹیشن تک کا تقریباً تین کلومیٹر کا فاصلہ کئی قسطوں میں طے کرکے ریلوے پلیٹ
فارم پر پہنچ گئے اور ٹرین آنے پر اس میں سوار ہوگئے ـــــ حسب معمول وہ
راستہ میں اور بھی لیٹ ہوتی گئی اور بالآخر اللہ اللہ کرکے دوسرے روز ۴/اکتوبر
۱۹۹۹ء کو صبح سوا نو بجے کے بجائے ایک بجے دن کے بعد ہم لوگ جموں اسٹیشن
پہنچ ہی گئے، وہاں سے عزیز گرامی مولانا خورشید صاحب اور قاری معین الدین
صاحب کی معیت میں ''ہوٹل مغل دربار'' آنا ہوا جہاں تقریباً ۲۲/گھنٹہ قیام رہا،
اللہ تعالیٰ بہترین جزا عطا فرمائے عزیز مولانا خورشید انور سلّمہٗ اور ان کے مہمان
قاری معین الدین صاحب کو جنہوں نے طویل اور مکلّف سفر کی تھکاوٹ وسستی کو
اپنے حسن اخلاق، حسن انتظام اور حسن کارکردگی کے ذریعہ محسوس ہی نہ ہونے
دیا۔

۵/اکتوبر کو دوپہر ۱:۳۰/بجے جیٹ ایرویز کے طیارہ کے ذریعہ جموں
سے روانہ ہوکر صرف ۳۵/منٹ میں ہم دونوں سری نگر پہنچ گئے جموں سے سری
نگر کی فضائی مسافت ۱۷۰/کلومیٹر کی ہے جب کہ سڑک کے ذریعہ یہی مسافت
ڈھائی سو کلومیٹر سے زائد ہے اور پہاڑیوں سے ہوکر گذرنے والے اس راستہ
سے تیز رفتار کار وغیرہ کے ذریعہ بھی یہ سفر کم از کم ۸/گھنٹہ میں ہو پاتا ہے، سری نگر
ہوائی اڈہ پر ہمارے اصل داعی جناب مولانا بشیر الدین صاحب مولانا محمد سالم
صاحب مظفرنگری، پانپور ضلع پلوامہ کے مولانا محمد بشیر صاحب اپنے دوسرے کئی
ساتھیوں کے ساتھ موجود تھے، یہ حضرات ہم کو اپنے ساتھ لے کر سب سے پہلے
ایرپورٹ کی قریبی بستی ہمہامہ میں واقع مدرسہ تصحیح القرآن آئے جہاں چند منٹ

قیام کے بعد مولانا بشیر الدین تو سوپور چلے گئے اور مدرسہ بیت العلوم کے مہتمم مولانا محمد بشیر صاحب ہمیں اپنے ساتھ لے کر پامپور آگئے، دوپہر کا کھانا اگرچہ ہم جموں سے کھا کر آئے تھے مگر چوں کہ مولانا محمد بشیر صاحب نے بھی کھانے کا انتظام کیا تھا اس لئے ان کی دلجوئی کی خاطر بہر حال اس ''رسم'' میں بھی شرکت کرنا پڑی۔ اس کے بعد ہم لوگ (یعنی ہم دونوں اور دارالعلوم سوپور کے استاذ مولانا محمد سالم صاحب (جن کو مولانا محمد بشیر صاحب نے مستقل طور پر ہمارے انس ودلجوئی کے لئے بطور رہبر ساتھ کر دیا تھا) اور مولانا محمد بشیر صاحب کے ساتھ کار کے ذریعہ سرینگر جامع مسجد آئے جہاں عصر کی جماعت تیار تھی۔ نماز کے بعد امام وخطیب جناب مولانا غلام نبی قاسمی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور جامع مسجد کی چوبی تعمیرات کا فنی کاریگری ومہارت کا مشاہدہ بھی کیا۔ پھر وہاں سے روانہ ہو کر ہم لوگ درگاہ حضرت بل آئے، حضرت بل کی اس درگاہ کو کسی ''مزار'' کی موجودگی یا اس کی نسبت سے ''درگاہ'' نہیں کہا جاتا ہے بلکہ روایت یہ ہے کہ یہاں مصدقہ طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ''موئے مبارک'' موجود ہے جس کی سال کی مختلف تاریخوں میں کل دس مرتبہ باقاعدہ زیارت کرائی جاتی ہے ہمارے پہنچنے سے دو روز قبل ہی ۲۲؍ جمادی الاخریٰ کو یوم وفات صدیق اکبرؓ کی مناسبت سے زیارت ہو چکی تھی۔ اس درگاہ کا نام برسوں پہلے (یعنی بچپن کی منزل میں) اس وقت سنا تھا جب یہاں سے ''موئے مبارک'' چرا لیا گیا تھا جس کا نہ صرف سرینگر بلکہ پورے کشمیر کے مسلمانوں نے بہت زبردست سوگ منایا تھا اور حکومت کی غفلت اور مجرمانہ لاپروائی کے خلاف شدید احتجاج کیا تھا جس کے نتیجہ میں بہت بڑا فساد پھوٹ پڑا تھا اور بالآخر سخت جدوجہد کے بعد یہ ''موئے مبارک'' حاصل ہوا اور اسے دوبارہ لا کر اسی درگاہ میں رکھا گیا اور اب حکومت کی طرف سے اس کی نگرانی وحفاظت کا اتنا سخت انتظام ہے کہ تلاشی کے بغیر کسی بھی شخص کو درگاہ کے اندر داخلہ کی بھی اجازت

نہیں مل پاتی جب کہ ''موئے مبارک'' جس جگہ محفوظ کیا گیا ہے وہاں تک کوئی عام آدمی جا بھی نہیں سکتا ہے۔

درگاہ کے اندر اگر ایک طرف بدعات کے کچھ مظاہر دیکھ کر طبیعت منقبض ہوئی تو دوسری طرف یہ منظر آنکھوں کو نور اور دل کو سرور عطا کر دینے کے لئے کافی تھا کہ بالائی منزل میں دو وردی پوش سپاہی اس حال میں تھے کہ ایک دوسرے کو قرآن مجید پڑھا رہا تھا —— اور یہ وہ منظر ہے جو کشمیر ہی میں سامنے آیا، ورنہ وردی پوش سپاہی اور تعلیم وتدریس قرآن؟ کہاں ہماری آنکھیں اس قابل کہ ایسے ''حسین منظر'' دیکھ سکیں؟

یہاں سے واپسی میں نماز مغرب دارالعلوم بلالیہ سرینگر کی مسجد میں ادا کی گئی جہاں نماز کے بعد مدرسہ کے مہتمم مولانا مفتی عبدالرشید صاحب و دیگر حضرات کی فرمائش پر چند منٹ کی تقریر بھی کی اور حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس مختصر بات میں بھی اثر پیدا کر دیا و ذالك فضل الله العظيم تقریر کے بعد مدرسہ کے دفتر میں مہتمم صاحب کے علاوہ دیگر کئی استاذوں اور مدرسہ کے بہی خواہوں کے ساتھ چائے پی، اس دوران سرینگر کے ایک دین پسند تاجر اور دارالعلوم بلالیہ کے ہمدرد وبہی خواہ محترم جناب منظور وانگو صاحب نے بہت اصرار کے ساتھ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ہونے والے مدرسہ کے جلسۂ دستار بندی میں شرکت کی دعوت دی جسے اس شرط کے ساتھ قبول کر لیا کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ۱۱؍ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ہماری لکھنؤ واپسی کا نظم کر دیا جائے جس کا وعدہ کر لیا گیا۔ اس کے بعد زعفران کے کھیتوں کی بستی پامپور واپس آ کر یہاں کے ایک تاجر اور مدرسہ بیت العلوم کے بہی خواہ ومعاون کے گھر آنے اور نماز عشا و طعام سے فراغت کے بعد رات کو یہیں آرام کیا۔

۶؍ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ایک صاحب دل بزرگ اور عالم دین حضرت مولانا محمد ابراہیم میاں جی گجراتی مجاز شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ

(مقیم حال ساؤتھ افریقہ) کو عمرہ سے فراغت کے بعد براہ دہلی سری نگر اور پھر
سوپور پہنچنا تھا اوران کے میزبان بھی مولانا بشیر الدین صاحب مہتمم دارالعلوم
سوپور ہی تھے اور نظام یہ طے تھا کہ ہم سب لوگ سری نگر ہوائی اڈہ کے قریب ضلع
بڈگام کی ایک بستی میں واقع محمد مظفر اتم صاحب کے مکان میں دوپہر کا کھانا
کھائیں گے چنانچہ ہم لوگ نماز ظہر سے پہلے مظفر صاحب کے مکان پر پہنچ گئے
جب کہ خود صاحب خانہ نیز مولانا بشیر الدین صاحب مولانا موصوف کے
استقبال کے لئے ہوائی اڈہ جا چکے تھے۔ ہم لوگ نماز ظہر سے فراغت کے بعد
معزز مہمان کی آمد کے منتظر تھے لیکن ۳ر بجے کے بعد ان حضرات نے واپس
آکر اطلاع دی کہ دہلی سے آنے والے جہاز آگئے مگر مولانا ابراہیم صاحب
نہیں آئے، بعد میں فون پر رابطہ قائم کرنے سے علم ہوا کہ جدہ سے روانہ ہونے
والے جہاز کے وقت مقررہ سے مؤخر ہونے کی وجہ سے مولانا دہلی اتنی تاخیر
سے پہنچ سکے کہ سرینگر کا جہاز نہیں مل سکا اور پھر وہ دوسرے روز سری نگر آسکے۔

بہر حال دوپہر کے کھانے سے سہ پہر کو فراغت پانے اور نماز عصر کی
ادائیگی کے بعد مقررہ پروگرام کے مطابق ہم لوگ سری نگر کے دارالعلوم قاسمیہ
میں آگئے جہاں نماز مغرب کے بعد میرا بیان ہونا تھا۔ یہ مدرسہ ابھی
۸-۱۰ر برس پہلے قائم ہوا ہے۔ مدرسہ کے مہتمم مولانا احمد سعید قاسمی صاحب
ایک متحرک اور فعال عالم ہیں ان کی اور ان کے معاونین کی مخلصانہ مساعی کے
ذریعہ مختصر عرصہ ہی میں مدرسہ متوسطات تک تعلیم کا ایک قابل اعتماد مرکز بن گیا
ہے کافی اچھی بلڈنگ بن چکی ہے اور ابھی تعمیری سلسلہ جاری ہے۔ فالحمدللہ
علی احسانہ۔ نماز مغرب کے بعد مدرسہ کی خوبصورت اور پر رونق مسجد میں
بیان ہوا جس میں طلبہ واساتذہ کے علاوہ شہر و بیرون شہر سے آئے مہمان بھی
شریک ہوئے۔ نماز عشا اور کھانے سے فراغت کے بعد رات کا قیام اسی مدرسہ
میں رہا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ۷ر اکتوبر ۱۹۹۹ء کا دن بہت

مشغول تھا کیوں کہ اس دن کئی جگہ پہنچنا تھا، چنانچہ جناب مولانا احمد سعید
صاحب کی رہبری میں سب سے پہلے ہم لوگ ربن نامی بستی میں واقع لڑکیوں
کے مدرسہ انوار الصالحات پہنچے جہاں (پردہ کی رعایت کے ساتھ) حدیث
شریف کی کتاب ریاض الصالحین اور فقہ کی کتاب شرح وقایہ کا افتتاحی سبق ہوا
اس کے بعد طالبات کی رعایت سے ضرورت حدیث وفقہ کے موضوع پر کچھ
بات کہی گئی اور پھر عام حاضرین کے سامنے مختصر گفتگو ہوئی۔ دوپہر کے کھانے
سے فراغت کے بعد قریبی بستی اچھبل کے مدرسہ انواریہ جانا ہوا۔ مدرسہ کے
مہتمم محمد فاروق صاحب محنتی اور جفاکش آدمی ہیں مدرسہ ابھی ابتدائی منزل میں
ہے مسجد زیر تعمیر ہے، اندر کے حصہ پر سلیپ پڑ چکی ہے، پہلی نماز ظہر ادا کر کے
ہم لوگوں نے اس مسجد میں باجماعت نماز کا آغاز کیا۔ یہاں سے بارہ مولہ شہر
کے لئے روانگی ہوئی، پہلے شہر کے کنارے اور پرفضا مقام پر واقع دارالعلوم سبیل
الرشاد پہنچے جہاں مدرسہ کے مہتمم جناب مولانا غلام محمد صاحب اوران کے رفقاء
وطلبہ ہمارے منتظر تھے مدرسہ کی عمارات اس کی مسجد اور حسن انتظام دیکھ کر بہت
مسرت ہوئی، یہیں مسجد کا وہ ''حمام'' بھی دیکھا جو کشمیر کی اکثر مساجد میں ضرور
بنایا جاتا ہے اور سردیوں کے موسم میں اس کے نیچے آگ دہکائی جاتی ہے جس
کے ذریعہ وضو وغیرہ کے لئے پانی بھی گرم ہو جاتا ہے اور ''حمام'' کا فرش اور پھر
پوری مسجد گرم ہو جاتی ہے یہ انتظام گویا ''ایر کنڈیشن'' کا کام کرتا ہے لیکن فرش
میں لگے پتھر کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے نیچے آگ کتنی ہی جلتی رہے اس میں
گرمی حد اعتدال کے اندر ہی رہتی ہے اور نمازی بآسانی اس پر چلتے پھرتے اور
نمازیں ادا کرتے رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر آرام کرنے اور چائے پینے کے بعد
بارہ مولہ کے تبلیغی مرکز کی مسجد پہنچ گئے جہاں نماز عصر کی ادائیگی کے بعد تقریر کا
نظام طے تھا اور پوری مسجد ماشاء اللہ نمازیوں سے پُر تھی۔ نماز کے بعد دین کی
اہمیت، اس کی حفاظت اور اس کی دعوت وتبلیغ کے موضوع پر بیان ہوا جسے بفضلہ

تعالیٰ توجہ کے ساتھ سنا گیا اور بات کی صداقت وقبولیت کے اثرات نمایاں طور پر نظر آئے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں مغرب کی نماز تبلیغی مرکز سوپور میں ادا کرنا تھی جہاں بعد مغرب تقریر کا پروگرام بھی تھا، مگر تاخیر ہوجانے کی وجہ سے نماز مغرب بھی بارہ مولہ ہی میں ادا کی گئی اور اس کے بعد سوپور کے لئے روانگی ہوئی۔ رات کا وقت، پھر بارش بھی شروع ہوگئی جس کی وجہ سے تقریباً ۲۰ رکلومیٹر کا یہ فاصلہ طے کرکے پہنچتے پہنچتے عشاء کا وقت ہوگیا اور پھر اس وقت مرکز کے بجائے قریب ہی میں واقع حاجی محمد اشرف اتم صاحب کے مکان میں ہم لوگ اترے۔ حاجی محمد اشرف اتم صاحب تبلیغی جماعت سے جڑے ہوئے ایک دیندار باشعور اور بڑے تاجر ہیں۔ کچھ ہی دیر کے بعد یہیں حضرت مولانا محمد ابراہیم میاں جی صاحب بھی تشریف لے آئے، مولانا پیرانہ رعب ودبدبہ'' سے دور ایک نیک، سادہ اور صاحب دل بزرگ ہیں۔ نماز عشاء کے بعد سب لوگوں نے ساتھ میں کھانا کھایا، کھانے کے بعد کشمیر کا ''زعفرانی قہوہ'' بھی پیا گیا۔ پھر کچھ دیر ہلکے پھلکے دینی موضوعات پر گفتگو رہی۔ حاجی محمد اشرف اتم صاحب نے بطور خاص متمول اور دین پسند مسلمانوں کے ان بچوں کے مستقبل کی طرف سے فکر مندی کا اظہار کیا جو ہمارے عام مدارس دینیہ میں داخل ہوکر تعلیم حاصل نہیں کرسکتے اور ''مروجہ عصری درس گاہوں'' میں جاکر دینی شعور سے بے گانے ہوجاتے ہیں —— اس مسئلہ کا بظاہر ایک ہی حل ایسی عصری علوم درس گاہوں کا قیام ہے جو پختہ دینی شعور کے حامل مسلمانوں کے زیر انتظام ہوں اور جہاں تعلیم وتربیت میں دینی خطوط کی پوری رعایت ہو۔

۸راکتوبر کی نمازِ فجر مرکز کی مسجد میں ادا کی گئی اور اس کے بعد کچھ دیر بیان ہوا۔ جماعتی نظام کے مطابق شب جمعہ میں مرکز میں قیام کرنے والوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی اور مسجد کا اندرونی حصہ حاضرین سے پُر تھا۔

ناشتہ سے فراغت کے بعد مولانا بشیر الدین صاحب نے ہم لوگوں کو ایک انجینئر صاحب کے ساتھ کشمیر کے معروف بزرگ بابا شکرالدین صاحب کی مزار دیکھنے اور فاتحہ خوانی کے لئے بھیجا۔ سوپور سے بانڈی پورہ جانے والے راستہ میں بہت اونچی پہاڑی پر واقع یہ مزار ان بزرگ کی نسبت اور پھر اپنے محل وقوع کے لحاظ سے واقعی ایک اہمیت رکھتی ہے، پہاڑوں کے پر پیچ راستوں پر چڑھتے ہوئے ایک خاص منزل تک تو ہم لوگ کار کے ذریعہ گئے۔ اس کے بعد زینوں سے چڑھ کر پہلے مزار سے متصل مسجد میں حاضر ہوکر دوگانہ نفل کی سعادت حاصل کی، اس کے بعد بابا شکرالدین کی مزار پہنچ کر ایصال ثواب کیا۔

عام مزاروں کی طرح یہ مزار بھی ''بدعات کی گرفت'' میں نظر آئی، اگرچہ ''ناکردنی'' کرنے والا کوئی موجود نہ تھا مگر مزار کے دروازہ میں بندھی ہوئی ''منتی چیٹیں'' گنڈے، چوڑیاں، اور انگوٹھیاں'' زبان حال سے سب کچھ بیان کررہی تھیں۔

پہاڑ کی اس بلند وبالا چوٹی سے نیچے کا منظر نہایت خوشنما نظر آتا ہے، سبزہ، اونچے نیچے مکانات اور بل کھاتی سڑکیں مل جل کر بہت ہی دلفریب منظر پیش کرتے ہیں۔

مولانا بشیر صاحب کی ہدایت کے مطابق یہاں سے واپسی میں ہم لوگ دارالعلوم سوپور سے متصل حاجی محمد اشرف ڈار صاحب کے مکان پہنچے۔ حاجی صاحب کے والد مرحوم ہی کے مخلصانہ تعاون سے یہ دارالعلوم قائم ہوا تھا اور اب حاجی صاحب بھی اس کے ذمہ دار معاونین میں سے ہیں۔

نماز جمعہ کی تیاری کے بعد ہم لوگوں کو دارالعلوم ہی سے متعلق بازار والی مسجد میں لے جایا گیا جہاں نماز سے قبل کچھ دیر بیان ہوا۔ نماز سے فراغت کے بعد ہم لوگ حاجی اشرف ڈار صاحب کے مکان واپس آگئے اور کچھ دیر کے بعد خانقاہ والی مسجد میں نماز کی ادائیگی کے بعد مولانا محمد ابراہیم صاحب بھی آگئے۔

دو پہر کے کھانے اور کچھ دیر قیلولہ کے بعد ہم سب لوگوں کو لے کر مولانا بشیر الدین صاحب اپنے گاؤں نیا پورہ کے مکتب میں گئے جہاں نماز عصر ادا کی گئی۔مکتب کے ذمہ داروں کے علاوہ گاؤں کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے ان کے سامنے کچھ دیر دین کی بات کی گئی اور مکاتب و مدارس کی ضرورت واہمیت بیان کی گئی۔ پھر حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کی دعا کے بعد ہم لوگ دار العلوم سوپور آگئے جہاں کی مسجد میں نماز مغرب ادا کی گئی۔

سوپور کا یہ دار العلوم اگر چہ بہت قدیم نہیں ہے اور اس کے بانی مولانا بشیر الدین صاحب ہی ہیں جن کی دار العلوم دیوبند سے فراغت ۱۹۷۲ء میں ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ اس دار العلوم کا قیام اس کے بعد ہی عمل میں آیا ہے۔ لیکن مولانا بشیر الدین صاحب اور ان کے معاونین کی مخلصانہ جدو جہد کے نتیجہ میں اس کا شمار کشمیر کے مرکزی مدارس میں ہوتا ہے۔ حاجی اشرف ڈار صاحب کے والد مرحوم کی وقف کردہ زمین میں مسجد اور مدرسہ کی وسیع تعمیرات کے علاوہ اس سے متصل کافی وسیع زمین بھی خرید لی گئی ہے جس پر مطبخ، دار الطعام ودیگر تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ اللہم زد فزد۔ مولانا بشیر الدین صاحب تو ایک متحرک فعال اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک ہیں ہی، اسی کے ساتھ حق تعالیٰ نے ان کو مولانا محمد سالم صاحب، قاری علی بشیر صاحب، مولانا خورشید انور صاحب (جموں والے مولانا خورشید انور نہیں) اور ان کے علاوہ دیگر مخلص و محنتی اساتذہ و معاونین بھی عطا کر دیئے ہیں اور سب مل جل کر اپنے دار العلوم کو شاہ راہ ترقی پر گامزن کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

مولانا بشیر الدین صاحب نے اپنے مدرسہ میں باقاعدہ جلسہ کا نظم کیا تھا۔ اور اپنے حلقۂ احباب و معاونین مدرسہ کی رعایت سے اس کی دو نشستیں رکھی تھیں۔ پہلی نشست بعد نماز مغرب سے عشاء تک اور دوسری دوسرے روز صبح ۹؍بجے سے (کشمیر کے مخصوص حالات کی وجہ سے رات کی نشست میں ان

لوگوں کے لئے شرکت کرنا ہی ممکن ہوتا ہے جو جلسہ کے بعد رات میں وہیں قیام کریں) پہلی نشست میں تلاوت و نعت خوانی کے بعد اصل بیان میرا ہی ہوا جس میں کافی تعداد میں لوگ اور علمائے کرام بھی شریک ہوئے، جلسہ مدرسہ کی مسجد میں ہوا تھا اور پوری مسجد حاضرین سے بھری ہوئی تھی۔ بیان کا سلسلہ ڈیڑھ گھنٹہ سے زائد چلا اور حق تعالیٰ نے اپنی توفیق اور مدد سے جو کچھ کہلوایا کہا گیا جس پر عام طور پر اہل علم، طلبہ اور عوام کی طرف سے اطمینان کا اظہار کیا گیا۔

نماز عشا اور کھانے سے فراغت کے بعد مختلف علاقوں سے آئے ہوئے پچاس سے زائد علمائے کرام اور ذمہ داران مدارس کے ساتھ ایک خصوصی نشست حاجی اشرف ڈار صاحب کے مکان کے وسیع ہال میں رہی جس میں خصوصیت کے ساتھ دینی تعلیم کے فروغ اور دینی مدارس کی ذمہ داریوں اور ان کی مشکلات جیسے مسائل زیر بحث آئے۔ ایک صاحب نے سری نگر کے ایک عیسائی مشنری اسکول کی طرف توجہ دلائی کہ وہاں اپنے بچوں کے واسطے صرف فارم داخلہ کے حصول کی خاطر پانچ ہزار مسلمانوں نے پوری رات لائن لگائی اور ان میں سے تین ہزار ہی فارم حاصل کر سکے جب کہ اس اسکول کی تعلیم اتنی مہنگی ہے کہ صرف سرمایہ دار ہی اپنے بچوں کو وہاں تعلیم دلوا سکتے ہیں اس کے برعکس دینی مدارس اور دوسرے عصری مسلم اداروں کی طرف متمول مسلمانوں کی اس طرح توجہ نہیں ہے۔ وہ ان اداروں کے ساتھ مالی تعاون تو کر دیتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو داخلہ دلا کر وہاں پڑھوانا مناسب نہیں سمجھتے —— مسلمانوں کے متمول طبقہ کی اس ''دین بے زاری'' اور اپنے ماحول و اداروں سے بے التفاتی کا کیا حل ہے؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ اس مسئلہ کا حل مسلمانوں کے متمول طبقہ کو ''دین بے زار'' قرار دینے میں نہیں ہے بلکہ اصل بات ''معیار'' کی ہے کہ آپ حضرات کے بیان کے مطابق سرینگر میں عیسائی آبادی نہ ہونے کے باوجود ان کا ایک ایسا معیاری تعلیمی ادارہ موجود ہے جس کے ذریعہ مسلمانوں کو

وہ اپنی طرف نہ صرف متوجہ کیئے ہوئے ہیں بلکہ تعلیم کی راہ سے وہ مسلم بچوں کے ناپختہ ذہنوں میں اپنی مذہبی وتہذیبی اقدار کی برتری بھی پیوست کررہے ہیں۔ اس ''معصوم زہر'' کا بس یہی ایک تریاق ہے کہ باشعور، دین پسند اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے انتظام ونگرانی میں اسی معیار بلکہ اس سے بہتر معیار کے اسکول قائم کئے جائیں جہاں مسلم بچے عصری علوم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود سچے اور پکے مسلمان بنے رہیں اوران کے دلوں میں ''عیسائی کلچر'' کے بجائے ''اسلامی کلچر'' کی عظمت ومحبت قائم ہو۔کام صبر آزما اور محنت طلب ضرور ہے لیکن اس کی زوداثری اور پائیداری سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مشاورت اور تبادلہ خیالات کا یہ سلسلہ رات ۱۲؍بجے کے بعد تک چلا، اس کے بعد سب لوگوں نے آرام کیا۔

۹؍اکتوبر ۱۹۹۹ء کو نماز فجر دارالعلوم کی مسجد میں ادا کی گئی اس کے بعد مولانا محمد ابراہیم میاں جی نے صرف ۱۵؍منٹ میں نہایت ہی مؤثر انداز میں ذکراللہ کی اہمیت وفضیلت بیان فرمائی، مولانا اگرچہ اصلاً ہندوستانی ہیں لیکن عرصہ دراز سے ساؤتھ افریقہ میں مقیم ہونے کی وجہ سے اردو سے زیادہ بہتر اور بے تکلف انداز میں انگریزی میں بات کرتے ہیں چنانچہ ان کی بات انگریزی ہی میں ہوئی جس کا ساتھ ہی ساتھ کشمیری میں ترجمہ ایک نوجوان انجینئر صاحب نے کیا۔مولانا کی بات سامعین تک براہ راست نہ پہنچنے کے باوجود اس قدر طاقت ور، مؤثر اور سچی تھی کہ ان کی فرمائش پر بات ختم ہوتے ہی پوری مسجد ذکراللہ سے گونج اٹھی۔اسم خداوندی اللہ اللہ، اور لاالٰہ الا اللہ کی والہانہ ضربوں سے دلوں کی دنیا زیروزبر ہونے لگے، ذاکرین میں خود مولانا ابراہیم صاحب کے علاوہ نہ جانے اور بھی کتنے اہل دل ہوں گے جن کی اللہ اللہ کی رٹ نے یقیناً رحمت خداوندی کو متوجہ کرلیا ہوگا۔ آہوں اور سسکیوں کے درمیان اس ''ذکر بالجہر'' کا سلسلہ نصف گھنٹہ سے زائد جاری رہا اوراس پورے وقت کواپنی

''تباہ حال'' زندگی کیلئے میں ایک قیمتی سرمایہ قرار دے سکتا ہوں۔ سچ ہے کہ ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر صبح ۹؍بجے دارالعلوم کے جلسہ کی دوسری نشست شروع ہوئی اس نشست میں رات سے مقیم مہمانوں کے علاوہ سوپورشہر اورقرب وجوار کے مسلمانوں نے بھی شرکت کی۔ دارالعلوم کے اساتذہ کے علاوہ آخر میں ایک گھنٹہ سے زائد میرا بھی بیان ہوا جس میں ''علماء وطلبہ کے علاوہ عام مسلمانوں کی رعایت سے بھی دین کی کچھ باتیں کہی گئیں۔حق تعالیٰ اپنے فضل سے قبول فرمائے۔(آمین)

جلسہ کے اختتام کے بعد مولانا بشیرالدین صاحب نے بتایا کہ دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کے مہتمم جناب مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنے بھائی اور مدرسہ کے ایک استاذ کواپنی گاڑی کے ساتھ بھیجا ہے اوردوپہر کا کھانا ہم لوگوں کو بانڈی پورہ پہنچ کروہیں کھانا ہے۔ چنانچہ اسی وقت وہاں کے لئے روانگی ہوگئی جاتے ہوئے بانڈی پورہ سے ۴؍کلومیٹر پہلے ترکہ پورہ نامی اس بستی میں ہم لوگ گئے جوعلاقہ میں ''قادیانیوں کی بستی'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔اسی بستی میں قادیانیوں کا مشہور مبلغ شمس الدین اوراس کا معاون شرف الدین رہتے ہیں، ان دونوں کے زیراثر ہی یہاں قادیانیت کوکافی نفوذ حاصل ہے۔کچھ عرصہ پہلے تک یہاں قادیانی ہی قادیانی تھے اور مسلمان کچھ تھے بھی تو بہت کمزور حالت میں ـــــ مگر اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولانا رحمت اللہ صاحب کو کہ انہوں نے دارالعلوم رحیمیہ کی شاخ کی صورت میں ایک مکتب قائم کردیا ہے۔ ہم لوگ سیدھے اسی مکتب میں گئے اور یہاں پہنچ کر اپنے مالک سے دعا کی کہ بار الٰہا! تو ہی کمزوروں کو طاقت بخشنے والا ہے اور ''ملعونوں کی یہ جماعت'' تیرے ہی نبی کی عزت وناموس پر حملہ آور ہے بس تو ہی اس سے انتقام لے لے، ہمیں دیکھ کر گاؤں کے کچھ مسلمان بھی جمع ہوگئے جن سے مل کر یہ اندازہ ہوا کہ بفضلہٖ

تعالیٰ مکتب کے قیام اور علماء کی آمد ورفت اور ان کی کوششوں نے ان لوگوں کو بھی بڑا حوصلہ عطا کر دیا ہے۔

یہاں سے ہو کر ہم پہلے دار العلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کی قدیم عمارت میں گئے جہاں اب صرف مکتب ہے یہیں دار العلوم رحیمیہ کے بانی اور اس کے روح رواں مولانا رحمت اللہ صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو ہم کو اپنے ساتھ لے کر پہاڑی کے اوپر مدرسہ کی جدید اور وسیع عمارت میں گئے۔ کشمیر کے دیگر مدارس کی طرح یہ مدرسہ بھی بس ۲۰ ربرس کے اندر ہی کا ہے مگر ماشاء اللہ اس نے قابل رشک ترقی کی ہے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب ماشاء اللہ ایک صاحب نسبت عالم ہیں جن کا روحانی تعلق استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی سے ہے، بے حد متحرک، خلیق اور متواضع شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بزرگوں سے نسبت اور اس نسبت کی قدر کرنے کا سلیقہ بھی حاصل ہے۔ ان کی ذاتی ذوق اور سعادت کی وجہ سے انہیں اپنے مرشد کے علاوہ دیگر بزرگوں کی بھی سرپرستی اور دعائیں حاصل رہیں جن کی برکتوں سے وہ اور ان کا ادارہ دونوں ہی مالا مال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نظر بد سے حفاظت فرمائے۔ (آمین)

مولانا نے بہت ہی پر تکلّف ضیافت فرمائی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یوپی والوں کے ذوق کی رعایت سے ''روٹی'' کا خصوصی انتظام کیا جسے عام کشمیری ''بے چارگی اور مسکنت کی علامت'' قرار دے کر مہمان کے کھانے میں پیش کرنا معیوب گردانتے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر نماز ظہر ادا کی گئی اس کے بعد مولانا اور مدرسہ کے دوسرے ذمہ داروں خصوصاً مفتی نذیر احمد صاحب کی فرمائش پر مسجد میں ہی کچھ دیر بیان بھی ہوا۔ اس مدرسہ میں مشکوٰۃ شریف تک کے طلبہ ہیں یعنی دار العلوم دیوبند کے نصاب کے مطابق جماعت ہفتم تک تعلیم کا نظم ہے۔ حالانکہ اسی تعلیمی سال کے دوران کچھ عرصہ پہلے مولانا نے درس بخاری شریف

کا بھی افتتاح کرالیا تھا مگر ابھی دورۂ حدیث کی جماعت نہیں ہے۔ طلبہ واساتذہ نظم وضبط کے پابند اور ''باوضع'' نظر آئے۔ جنہیں دیکھ کر اور ان سے مل کر ''بڑی اپنائیت'' کا احساس ہوا۔

بانڈی پورہ سرحدی علاقہ ہے جہاں سے وہ پہاڑ بھی صاف نظر آتے ہیں جن کا ایک حصہ پاکستان میں ہے۔ یہیں مولانا نے ایک ایسی پہاڑی بھی دکھائی جس پر ماہ اکتوبر میں بھی برف جمی ہوئی تھی۔ یعنی پورا سال گذر جاتا ہے اور اس کی برف ختم نہیں ہوتی حتیٰ کہ پھر موسم سرما آجاتا ہے اور نئی برف جمنے لگتی ہے، مدرسہ بہت ہی پر فضا اور پرسکون جگہ پر واقع ہے اور ماحول بھی سازگار معلوم ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ شرور وفتن سے حفاظت فرما کر اس مدرسہ کو اپنے دین حق کی خدمت واشاعت کے لئے قبول فرمائے۔ (آمین)

نماز عصر سے قبل ہی ہم لوگ یہاں سے سوپور واپسی کے لئے روانہ ہو گئے اور جس وقت ہم لوگ دار العلوم سوپور پہنچے تو مسجد میں عصر کی جماعت ہو چکی تھی۔ ہم لوگوں نے مدرسہ کے ایک کمرہ میں باجماعت عصر کی نماز ادا کی، اس کے بعد دار العلوم رحیمیہ کے احباب رخصت ہو گئے اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر دار العلوم سوپور کے مفتی صاحب اور دوسرے کئی استاذ دریائے جہلم کے کنارے آگئے۔ ان حضرات کے ساتھ ہم نے کشتی میں بیٹھ کر دریائے جہلم کی سیر کی اور پھر واپس آکر نماز مغرب ادا کی۔ مغرب اور پھر عشاء کی نمازوں کے بعد آنے والے احباب سے ملاقاتوں کا سلسلہ رہا، پھر کھانا کھانے کے بعد حاجی اشرف ڈار صاحب کے مکان ہی میں رات کو آرام کیا۔

۱۰؍اکتوبر کو نماز عصر تک ہمیں دار العلوم بلالیہ سری نگر پہنچنا تھا جہاں کے جلسۂ دستار بندی میں شرکت ہی کے لئے پہلے سے طے شدہ پروگرام میں تبدیلی کی گئی تھی ورنہ سابقہ پروگرام کے مطابق ۱۰؍اکتوبر ہی کو ہمیں سری نگر سے جموں اور پھر اسی رات جموں سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہو جانا تھا۔ لیکن سری نگر پہنچنے

سے پہلے اور پھر سری نگر پہنچ کر بھی دارالعلوم بلالیہ جانے سے پہلے ہمیں کئی جگہ پہنچنا تھا چنانچہ سب سے پہلے نیاپورہ نامی ایک دوسری بستی میں قائم شدہ مکتب گئے جہاں کے ناظم مولانا مقصود صاحب ایک روز پہلے ہی سے اسی غرض سے سوپور میں مقیم تھے۔ پھر دارالعلوم فاروقیہ کے ایک قدیم طالب علم اور جموں کے مدرسہ تعلیم القرآن کے استاذ مولانا خورشید انور صاحب سلّمہٗ کے بھائی حافظ اظہار صاحب سلّمہٗ بھی اسی مکتب میں استاذ ہیں اور ان کا بھی اصرار تھا، بہرحال ہم لوگ دو کاروں میں سوار ہو کر نہایت اونچی پہاڑی اور بہت ہی پرفضا مقام پر واقع اس مکتب میں پہنچے جہاں باقاعدہ جلسہ کا انتظام تھا اور کافی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ کچھ دیر میرا بیان ہوا اس کے بعد مولانا ابراہیم صاحب نے دعا کی۔ یہاں سے پھر ہم لوگ سوپور واپس آئے جہاں تبلیغی مرکز کی نئی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا جانا تھا۔ اس تقریب سعید میں شرکت کے بعد ہم لوگ سری نگر کے لئے روانہ ہوگئے۔ سوپور کو ''سیبوں کی نگری'' یا ''ایپل ٹاؤن'' کے نام سے جانا جاتا ہے اور واقعی یہاں سیبوں کے باغات بالکل اسی طرح ہیں جس طرح ہمارے کاکوری اور ملیح آباد کے علاقہ میں آموں کے باغات ہیں۔ یہ سیبوں کی بھرپور فصل کا وقت تھا اس لئے باغات گھومنے کو بھی ملے اور مختلف انواع کے سیب کھانے کو بھی ملے۔ ہمارے سوپور کے میزبان حاجی محمد اشرف ڈار صاحب بھی ماشاء اللہ ایک بہت بڑے اور شاداب باغ کے مالک ہیں اور ان کا باغ سوپور سے سری نگر جانے والے راستہ ہی میں کچھ اندر جا کر ہے، حاجی صاحب خاص طور پر اپنا باغ دکھانے ہی کے لئے یہاں تک ہم لوگوں کے ساتھ آئے، باغ کے اندر گئے سیب کھائے بھی اور لائے بھی، جو سری نگر تک راستہ میں سب لوگوں نے کھائے۔

سری نگر میں پہلے ہم لوگ ہوائی اڈہ کے قریبی بستی ہمہامہ کے اس مدرسہ تصحیح القرآن گئے جہاں پہلے بھی سری نگر وارد ہوتے ہی تھوڑی دیر کے لئے جانا

ہوا تھا مگر آج یہاں مسجد کے سنگ بنیاد اور اس کی مناسبت سے جلسہ کا اہتمام تھا، کافی تعداد میں علماء کرام موجود تھے۔ اور جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب کو تو دہلی جانا تھا اور ان کے جہاز کا وقت ہو گیا تھا اس لئے ہم لوگ اختتام جلسہ سے کچھ پہلے ہی اسٹیج سے اتر کر آگئے اور مسجد کی بنیاد رکھ دی گئی، اس کے بعد مولانا ہم لوگوں سے رخصت ہو کر ایئر پورٹ چلے گئے۔

جلسہ کے اختتام اور نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد علماء و مشائخ کے دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد دارالعلوم بلالیہ کی گاڑی آگئی جس پر سوار ہو کر نماز عصر کے وقت مدرسہ بلالیہ پہنچ گئے، یہاں ایک بہت بڑے جلسہ کا اہتمام تھا اور کافی بھیڑ بھاڑ تھی، قرب وجوار کے علماء کرام کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تجوید کے استاذ جناب قاری عبدالرؤف صاحب بھی بطور خاص اس جلسہ میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ پونچھ سے برادرم مولانا غلام قادر صاحب بھی آئے تھے، مفتی عبدالرحیم صاحب اور مولانا حمید اللہ صاحب مجاز حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی سے بھی یہیں نیاز حاصل ہوا۔ بعد نماز مغرب کی نشست میں پہلے مدرسہ سے تکمیل حفظ قرآن کرنے والے حفاظ کی دستار بندی ہوئی پھر جناب مولانا حمید اللہ صاحب نے نہایت ہی پرسوز، پراثر اور طویل دعا کرائی اس کے بعد مجھے بیان کی دعوت دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم، علمائے کرام کی توجہ اور بزرگوں کی دعاؤں سے حق تعالیٰ نے اچھی اور کارآمد باتیں کہلوائیں۔ حق تعالیٰ کہنے والے اور سننے والوں کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

بیان کے بعد ہم نے دوسرے بہت سے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس کے بعد نماز عشاء کیلئے نکلے تھے کہ جناب منظور وانگو صاحب مل گئے۔ بہت شاداں وفرحاں اور بے حد متاثر تھے ـــــ بڑے جوش کے ساتھ بولے کہ نماز کے بعد آپ ہمارے ساتھ ہی چلیں گے اور گھر ہی پر قیام رہے گا، اور پھر یہی ہوا

کہ نماز کے بعد ہم دونوں (میں اور فرزند عزیز مولوی حافظ عبدالمعبود سلّمہٗ)
منظور صاحب کے ساتھ ان کے مکان آگئے اور رات کو قیام کے بعد صبح ۹ ربجے
ان ہی کے گھر سے ہوائی اڈہ کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ہوائی اڈہ سے کچھ
پہلے دارالعلوم بلالیہ کی ایک شاخ میں اترے، وہاں جلسہ تھا، ذمہ داروں کی
خواہش تھی کہ یہاں بھی کچھ دیر بیان ہوجائے لیکن جلسہ کا وقت ۱۱ ربجے دن
سے تھا۔ باوجودیکہ مدرسہ میں قیام تقریباً پونے بارہ بجے تک رہا لیکن جلسہ کی
باضابطہ کارروائی اس وقت تک شروع نہ ہوسکی اور ہمارے جہاز کا وقت ۱ ربجے
دن میں تھا اس لئے ہم لوگ رخصت ہوکر ایئرپورٹ آگئے اور انڈین ایئرلائن
کی پرواز سے ایک بجے براہ جموں روانہ ہوکر ۳:۳۰ ربجے دہلی پہنچ گئے، حسن
اتفاق سے اسی پرواز میں حاجی محمد اشرف انم صاحب بھی دہلی تک ساتھ آئے
جن سے دہلی پہنچ کر کافی مدد ملی۔ حق تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)
شام کو ۵:۴۰ رپر دوسری پرواز کے ذریعہ دہلی سے روانہ ہوکر ۵۵ رمنٹ میں
بعافیت تمام لکھنؤ ایئرپورٹ پہنچ گئے —— اور اس طرح تقریباً ۹ ردن کا یہ
دلچسپ اور یادگاری سفر ختم ہوا۔ فللہ الحمد اولہ و آخرہ۔

کچھ اور قابل ذکر مشاہدات وتاثرات

(۱) کشمیر کا سفر کرنے سے پہلے ہماری نظر میں اس سفر کی کوئی بہت
خصوصی اہمیت نہیں تھی کیوں کہ ہم اسے اپنے ہی ملک کے ایک صوبہ سے
دوسرے صوبہ کا سفر ہی سمجھ رہے تھے اور اس قسم کے سفر تو ہوتے ہی رہتے ہیں
—— لیکن کشمیر جاکر اس کی ''خصوصی اہمیت'' کا احساس ہوا۔
واقعہ تو بہرحال یہی ہے کہ کشمیر ہمارے وسیع ملک کا ایک حصہ ہے بلکہ
''مروجہ سیاست'' کی زبان میں کہا جائے تو ''اٹوٹ انگ'' ہے —— لیکن
ہماری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب جگہ جگہ ہمارے اپنے ہی ''فوجی
جوانوں'' نے ہمارا استقبال کچھ اس طرح کیا جیسے ''ہم ہندوستانی'' کسی غیر ملک

میں داخل ہورہے ہوں اور ''وہاں کے فوجی جوان'' ہماری جانچ پرکھ کررہے
ہوں۔ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ شناختی کارڈ دکھاؤ؟ نہیں ہے تو
''ہندوستانی'' ہونے کا کیا ثبوت ہے؟ گاڑی سے اتر کر اتنے دور پیدل چلو،
سامان کھول کر چیک کراؤ؟ ۶:۳۰ ربجے شام کے بعد نہیں آنے دیا جائے گا۔
اور پھر اس کے ساتھ ہی پوری جامہ تلاشی —— اگر ''حسن اتفاق'' سے کوئی
آفیسر قسم کا فوجی سامنے آگیا تو مرحلہ آسان ورنہ ''سپاہی ٹائپ'' فوجی جوانوں
کی ہیکڑی اور اکڑ برر کے سامنے سب لاچار —— یہ صورتحال ہم جیسے ''چند
روز کے مہمانوں'' کے لئے جب انتہائی دل آزار، توہین آمیز اور ''قومی غیرت''
کو للکارنے والی تھی تو ظاہر ہے کہ ان ''کشمیریوں'' پر کیا گذرتی ہوگی جن کو
مستقل طور پر اسی کا سامنا ہے اور ایک دو دن نہیں، برسہابرس سے وہ اسی ماحول
میں جینے پر مجبور ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ ''دراندازوں'' کی طرف سے خطرات بنے
رہتے ہیں اور ''سرحدی علاقہ'' ہونے کی وجہ سے چوکسی ضروری ہے ——
مگر ''اپنوں'' اور ''بیگانوں'' میں کچھ فرق تو ہونا چاہئے، اور ''فوجی رنگروٹوں''
کے لئے بھی تو کچھ تہذیب واخلاق اور شائستگی کی پابندیاں ہونا چاہئے۔
کشمیر میں فوج حالات کو سدھارنے کے لئے بھیجی گئی ہے اور یقینی طور پر
یہ کام کشمیریوں کا دل جیت کر اور ان میں خوداعتمادی پیدا کرکے ہی ہوسکتا ہے
جب کہ وہاں آج بھی حالت یہ ہے کہ کشمیر کی راجدھانی سری نگر میں بھی
دوکانیں عصر کے بعد ہی سے بند ہونا شروع ہوجاتی ہیں اور مغرب تک
بازاروں میں سناٹا ہوجاتا ہے۔ رات کے وقت کسی نقل وحمل کا تصور نہیں، جو
جہاں ہے وہیں رکنے پر مجبور اور سڑکوں وشاہراہوں پر فوجی سپاہیوں کی حکمرانی۔
''جنت نظیر'' کشمیر کے باسیوں کی یہ ''بے بسی'' دیکھ کر ہم اپنے پروردگار کا
ہزار بار شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اس ''پنجڑے کی جنت'' سے دور ہی
رکھا، ساتھ ہی ان ''بے بس ہندوستانیوں'' کے لئے دعا کرتے ہیں جو زبان

حال سے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ؎

واعظ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

(۲) کشمیر کے مدارس اور دینی حلقوں کی ایک بہت اہم قابل ذکر اور لائق تعریف خوبی ''باہمی ربط وموانست'' نظر آئی اور یقینی طور پر یہ اسی کا فیضان تھا کہ ایک مختصر سی مدت میں میری اتنے بہت سے مدارس ومکاتب میں حاضری اور علماء، طلبہ ومشائخ سے ملاقات ہوگئی۔ ارشاد خداوندی عسیٰ أن تکرھوا شیئاً و ھو خیرلکم (بسا اوقات تم کسی چیز کو ناگوار سمجھتے ہو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بھلی ہوتی ہے) کی صداقت کشمیر کے دینی حلقوں کے درمیان ربط وتعلق کی صورت میں نظر آئی، جو یقیناً ''ناگوار اور پریشان کن حالات'' کا امید افزا اور روشن پہلو کہلانے کا مستحق ہے۔

اس سفر میں میری کشمیر حاضری جیسا کہ بیان کیا جاچکا مولانا بشیر الدین صاحب مہتمم دارالعلوم سوپور کی دعوت پر ہوئی تھی مگر عملی طور پر یہ محسوس ہی نہ ہوسکا کہ میں ''اصل مہمان'' کس کا ہوں؟ اور میرا اصل بیان کس ادارہ میں ہونا ہے؟ اس قابل رشک اور لائق تعریف ربط وتعلق کو دیکھ کر اور برت کر دل بہت خوش ہوا کہ ہر مدرسہ میں دوسرے کئی مدارس کے ذمہ داران موجود ملے اور سب ایک دوسرے کے خیر خواہ اور معاون نظر آئے —— یہی نہیں بلکہ تبلیغی حلقہ اور علمائے مدارس کے درمیان اس طرح اتحاد ویگانگت نظر آئی کہ یہ احساس ہی نہ ہوسکا کہ کون کس کام کا ہے؟ علماء مدارس جماعتی کام میں پیش پیش اور جماعتی حضرات اپنے علماء کے قدردان اور مدارس کے بہترین معاون —— ہونا تو ہر جگہ یہی چاہئے اور سچی دینداری کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تحزّب اور گروہ بندی نہ ہو، مگر اس کی جیسی واضح اور عام مثال کشمیر میں نظر آئی وہ دوسرے مقامات پر دیکھنے کو نہیں مل پاتی —— اللہ تعالیٰ نظر بد سے بچا کر اس کے بہترین ثمرات

سے نوازے۔ (آمین)

(۳) روداد سفر مکمل نہ ہوگی اگر کشمیریوں کے کھانے کا ذکر نہ کیا جائے۔ کھانے کا یہ انداز تو سنت کے مطابق اور باعث برکت ہوتا ہے کہ عام طور پر دعوتوں میں تانبے کی ایک بڑی سی پلیٹ میں چار چار آدمی ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ زمینی دسترخوان اور تانبے ہی کے لوٹے اور سِلفچی کا استعمال عام ہے۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے اور کھانے کی جس طرح اضاعت ہوتی ہے اسے کس نام سے یاد کیا جائے؟ کشمیری گوشت خوری کے سلسلہ میں بڑے ''پکے مسلمان'' ہوتے ہیں اور بڑی دعوتوں میں ان کا مخصوص کھانا ''وازوان'' سرمایۂ افتخار ہے جس میں گوشت ہی کو ۶-۷/ الگ الگ طریقوں سے پکایا جاتا ہے —— کھلانے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسی چار آدمیوں والی پلیٹ میں چاول بھر کر اس کے چار کونوں میں الگ الگ سالن اور گوشت ڈال کر پیش کردیا جاتا ہے۔ پھر درمیان درمیان کھلانے والے ہر قسم کا گوشت چاروں کھانے والوں کے سامنے اسی پلیٹ کے اندر مقررہ مقدار میں رکھتے جاتے ہیں اور اس کام میں وہ اتنے ''سدھے'' ہوئے ہوتے ہیں کہ کھانے والے کے روکنے یا منع کرنے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ انہیں تو بس ''اپنا کام'' کرنا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ کھانے والا کھا بھی سکے گا یا نہیں؟ وہ چاول ڈالنے کے وقت چاول اور گوشت ڈالنے کے وقت گوشت ڈال ہی دے گا اور اس سلسلہ میں ''مساوات'' کا اس قدر لحاظ رکھے گا کہ اگر اتفاق سے چار میں سے کوئی ایک کھا کر فارغ بھی ہوچکا ہو تو بھی اس کے سامنے والے حصہ میں بھی ''اس کا حصہ'' رکھ کر اپنی ''ذمہ داری'' سے سبکدوش ہوجائے گا —— کھانے والے اپنے حصہ کا سب کھا بھی لیتے ہیں، لیکن سب ہی اتنے ''باہمت'' تو نہیں ہوتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر دسترخوان سے ڈھیروں گوشت اور چاول بچ جاتا ہے جو ظاہر ہے کہ دوبارہ مہمانوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہیں ہوتا —— معلوم یہ ہوا کہ شادی

بیاہ کی دعوتوں میں ہر پلیٹ کے ساتھ چار پلاسٹک کی تھیلیاں بھی فراہم کی جاتی ہیں کہ جو کھا سکو کھالو اور ''تمہارے حصہ'' کا جو بچ جائے اسے ساتھ لے جاؤ ——— یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ میزبان کی اس ''فراخ دلی'' سے کتنے مہمان فائدہ اٹھاتے ہیں؟

کشمیر کے لوگ اپنے کھلانے کے اس انداز کو ''محبت'' سے تعبیر کریں یا ''فیاضی'' سے لیکن ہے بہر حال یہ ''اسراف واضاعت'' جس کا احساس خود کشمیر کے دین پسند وباشعور مسلمانوں کو بھی ہونے لگا ہے جس سے امید کی جاتی ہے کہ انشاء اللہ اس ''رسم بد'' پر روک لگے گی۔

سفرِ بمبئی وبھیونڈی

پچھلے مہینے بمبئی وبھیونڈی کا سفر بعض مخلصین کی دعوت پر ہوا۔ میرے ہمراہ برادر عزیز مولوی عبدالولی فاروقی سلّمہٗ بھی تھے، بمبئی میں ۱۱؍روز یعنی ۳۰؍ذی الحجہ تا ۱۰؍محرم قیام رہا اور وہاں سانتا کروز میں دس تقریریں میری اور پارلے میں ۸؍تقریریں برادر عزیز سلّمہٗ کی ہوئیں۔ پھر بھیونڈی جانا ہوا اور وہاں چار روزہ قیام کے دوران ۶؍تقریریں میری اور ۴؍تقریریں برادر عزیز سلّمہٗ کی ہوئیں۔

بمبئی عروس البلاد ہے اور بہت سے اعتبارات سے اس کو مرکزیت حاصل ہے۔ ماضی میں اس شہر پر رضاخانیت کا غلبہ تھا مگر بفضلہٖ تعالیٰ علماء ربانیین کی مسلسل جدوجہد کی بدولت جہالت کے دبیز پردے چاک ہوئے پھر تبلیغی کام اور اس کام میں لگے ہوئے لوگوں کی انتھک محنتوں کے نتیجہ میں بڑی تعداد میں مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح ہوئی اور ہورہی ہے۔ مگر اب بھی وہاں بہت کام کی ضرورت ہے۔

محرم الحرام اور ربیع الاول کے موقع پر ''سیزنل'' مولوی صاحبان کی بڑی تعداد وہاں اکٹھا ہوتی ہے اور وہاں کی کئی تنظیمیں ''ذکر شہادت'' اور ''میلاد شریف'' سے منسوب رسمی محفلوں میں ان کو اپنے طور پر ''معاملات طے کرکے'' بھیجتی ہیں۔

وہاں جاکر یہ علم ہوا کہ یہ ''سیزنل مولوی صاحبان'' ۲؍گریڈ کے ہوتے ہیں ''اے گریڈ'' اور ''بی گریڈ''۔ چنانچہ سانتا کروز میں جہاں میری تقریریں ہورہی تھیں اس سے قریب ہی ایک ''سیزنل مولوی صاحب'' کی بھی تقریر ہورہی

تھی جن کے بارے میں علم ہوا کہ انہیں ''بی گریڈ'' کا کہہ کر بھیجا گیا ہے اوران کے ساتھ وہی معاملات بھی ہوئے۔

ان بی گریڈ کے مولوی صاحب نے روز اول ہی سے اپنے ''قومی شعار'' کے مطابق علماء حق کو برا بھلا کہنا اوران کی شان میں گستاخانہ حملے کرنا شروع کردیئے۔ غالبًاان کے خیال میں یہی ''ذکرشہادت'' تھا۔مگر چوں کہ وہاں کے کچھ لوگ میرے یہاں بھی تقریروں میں آتے جاتے رہتے تھےاس لئے دوچار دن گذرنے کے بعد کچھ لوگوں نے ان کو برسر محفل ٹوک دیا کہ مولوی صاحب آپ کوان وہابی لہابی اور۲۴، ۴۸ نمبر کے جھگڑوں کونمٹانے کے لئے نہیں بلایا گیا ہے آپ اسی طرح کچھ کام کی باتیں کیجئے جس طرح قریب ہی دوسری محفل میں ہورہی ہیں کہ اس میں نہ کسی پرلعن طعن ہوتا ہےاور نہ ہی کسی کی پگڑی اچھالی جاتی ہے بلکہ صاف اورسیدھے انداز میں اللہ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام بیان کر کے مسلمانوں کوان کے اتباع کی دعوت دی جاتی ہے۔

مولوی صاحب بیچارے چوں کہ ''بی گریڈ'' کے تھےاس لئے زیادہ دم خم دکھائے بغیر خاموش ہوگئے اور دوسرے دن سے انہوں نے نمٹانے والا انداز اختیار کرلیابعد میں یہ بھی سننے میں آیا کہ کسی دن میری تقریر میں بھی تشریف لائے تھے۔معلوم نہیں کس غرض سے؟امتحان لینے کے لئے یا یہ جاننے کے لئے کہ اللہ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کیوں کر بیان کئے جاتے ہیں؟۔

یہ تو ہوئی بی گریڈ کے مولوی صاحب کی بات!اب ایک ''اے گریڈ کے مولوی صاحب'' کی بات بھی سنتے چلئے چوں کہ وہ اے گریڈ کے تھےاس لئے ان کوذرااونچی بات کہنا تھی۔اسی لئے علمائے حق کے بجائے سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کوانہوں نے نشانہ بنانا مناسب سمجھا۔

دوران تقریر بڑے جوش اور طمطراق کے ساتھ آں موصوف نے فرمایا کہ ''یہ وہابی اطاعت رسول اطاعت رسول کی جورٹ لگاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے

کہ ان کے دلوں میں محبت رسول نہیں ہے حالاں کہ رسول کی اطاعت نہیں بلکہ ان کی محبت ضروری ہے۔''

مولوی صاحب کے جاہل شیدائیوں نے نعرۂ رسالت یارسول اللہ لگا کر مولوی صاحب کے جوش وخروش کوسوارت کیا اور مولوی صاحب بہت خوش ہوئے کہ چلو تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔

لیکن ذرا سوچئے تو سہی کہ مولوی صاحب اپنا الّو سیدھا کرنے کی خاطر کیا بات کہہ گئے؟ انہوں نے وہی حرکت کی جیسے کوئی شخص کسی کولکھنؤ سے دہلی پہنچانے کا وعدہ کر کے چلے اور پھر راستہ میں اس کومرادآباد ہی میں اتار دے اور کہے کہ یہی دہلی ہے بس تم اسی کو دہلی سمجھواور یہیں پہنچانے کا ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ٹھیک اسی طرح محبت واطاعت کا معاملہ ہے کہ اطاعت کے جذبہ بغیر محبت کے پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔اطاعت منزل مقصود ہے محبت تو راستہ کی چیز ہے، بلکہ یوں کہئے کہ اطاعت محبت کا ثبوت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے دعویٰ کے لئے بطور ثبوت اپنے رسول کی اطاعت طلب کرتے ہوئے فرمایاقل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی (اے رسول! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہوتو میری اطاعت کرو۔) اور پھرفرمایا:من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کرلی۔'' اسی طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت واضح کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ''ما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا'' جورسول دیں اسے اختیار کرلواور جس سے روک دیں رک جاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا اطاعت رسول کا حکم دیا ہے پھر بھی اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اطاعت رسول کی کوئی ضرورت نہیں ہے بس محبت رسول کافی ہے تو ایسے گندم نما جوفروش کی عقل پر ماتم کرنے اوراس کے لئے ہدایت کی دعا کرنے کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے؟

صحابہ کرامؓ کی بے مثل قربانیاں اور اطاعت رسول کی خاطر اپنی جانوں کی بازیاں لگا دینا، اپنے مال، اپنی اولاد اور اپنے وطن کو خیر باد کہنا اور پھر اس کے صلہ میں خداوند قدوس کی طرف سے ان کو رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ (اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے) کا سرٹیفیکٹ ملنا کیا کافی ثبوت نہیں ہے؟

کیا ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، اور علی مرتضیٰؓ سے زیادہ رسول کی محبت کسی کے دل میں ہوسکتی ہے؟ پھر ان جاں نثاروں نے اس محبت کی خاطر کیا کیا؟ انہوں نے اطاعت رسول کی اور ایسی اطاعت کی کہ جس کی مثال دنیا کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اور اگر اطاعت کے بغیر بھی محبت معتبر ہوتی اور اس محبت کی کوئی حقیقت ہوتی تو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابوطالب کے ایمان کی تمنا نہ کرتے۔ کیا ابوطالب کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور بے پناہ محبت کا کوئی انکار کرسکتا ہے؟ پھر کیا ان کی اطاعت کے بغیر یہ محبت ان کے کام آسکی؟

ان واضح حقائق کی موجودگی میں کسی ''اے گریڈ'' یا ''بی گریڈ'' کے مولوی کو یہ حق کیسے مل سکتا ہے کہ وہ اطاعت رسول کو غیر ضروری قرار دے کر صرف محبت رسول کو ضروری قرار دے؟ حق تعالیٰ تمام مسلمانوں کی شرور و فتن سے حفاظت فرما کر صراط مستقیم کی توفیق ارزانی فرمائے۔ (آمین)

بھیونڈی میں ہمارے اصل داعی مخلص مکرم برادر محترم ڈاکٹر منظور احمد قاسمی تھے لیکن وہاں کے ۴ روزہ قیام کے دوران ان کے علاوہ برادرم حافظ مسرور احمد اور محترم مولانا حافظ شہاب الدین صاحب نے بھی ہر طرح دل بستگی اور راحت رسانی کا انتظام کیا۔ فجزاهم الله عنا خير الجزاء۔

بھیونڈی میں تبلیغی کام بہت اطمینان بخش انداز میں ہو رہا ہے اور وہاں کے کام کی نوعیت دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہاں بانی جماعت تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے بتائے ہوئے خطوط پر کام

ہو رہا ہے اور ان کی ہدایات کی پابندی کا اہتمام ہے۔

مجھے وہاں تبلیغی مرکز میں بھی تقریر کا موقع ملا اور خدا کا فضل ہے کہ بہت سی کام کی باتیں زبان پر آگئیں۔ حق تعالیٰ ہم کو اور تمام مسلمانوں کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وہاں کے تبلیغی کام کے سلسلہ میں ''یونس برادران'' یعنی امیر جماعت حاجی محمد یونس صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی محمد عثمان صاحب نے بہت متاثر کیا۔

اب سے کچھ سال پیشتر تک بھیونڈی بھی رضاخانیت کی آماجگاہ تھی اور آئے دن فتنہ و فساد ہوا کرتا تھا۔ ابھی چند سال پہلے ہی ایک مناظرہ کا بھی اعلان ہوا تھا۔ جس کی شرائط طے ہونے میں ہی دس دن لگ گئے تھے پھر بھی طے نہ ہوسکی تھیں۔ مگر بہرحال حق واضح ہو کر رہا تھا اور باطل کو منہ کی کھانی پڑی تھی۔

جہاں اس مناظرے کی خوشگوار یاد جناب محمد عمر عبدالستار صاحب کی شکل میں نظر آئی جن کو حق تعالیٰ نے اسی موقع پر قبول حق کی توفیق عطا فرمائی تھی وہیں اس کی ایک تکلیف دہ یاد اس عدالتی مقدمہ کی شکل میں موجود ہے جو ایک مسجد کی زمین کی ملکیت کے سلسلہ میں فریقین کے درمیان قائم ہے۔

بھیونڈی میں تقریروں کے دوران زیادہ اسی پر زور دیا گیا کہ اصلاح عقائد و اعمال اور چیز ہے، اور فتنہ اندازی اور چیز! اصلاح عقائد کی مہم وہ ہے جو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد وحید ہے اور فتنہ وہ چیز ہے جس کو قرآن نے الفتنة اشد من القتل (فتنہ قتل سے بڑھ کر خطرناک ہے) کہہ کر رد کیا ہے۔

لہٰذا مسلمانوں کو اپنے اور اپنے بھائیوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کی فکر کرنا چاہئے لیکن فتنہ انگیزی اور فتنہ پروری سے گریز کرنا چاہئے۔

بھیونڈی میں بفضلہ تعالیٰ تبلیغی جماعت کا اچھا اثر ہے اور مقامی علماء بھی اس میں پیش پیش ہیں۔ وہاں جس ڈھنگ سے کام ہو رہا ہے اس سے توقع ہے کہ ان شاء اللہ مستقبل میں بھی مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کا اچھا کام ہوگا۔

کلکتہ کا ایک سفر

ہمارے ملک کے عظیم شہروں میں ایک شہر کلکتہ بھی ہے، جس کا نام بدل کر اگر چہ کولکتہ کر دیا گیا ہے لیکن آج بھی زبانوں پر وہی پرانا نام کلکتہ چڑھا ہوا ہے۔

کلکتہ کو نہ صرف ملک کے بہت بڑے صنعتی شہر اور مغربی بنگال کے دارالحکومت اور راجدھانی ہونے کی حیثیت حاصل ہے، بلکہ تاریخی، جغرافیائی اور مذہبی حیثیت سے بھی اس شہر کا ایک منفرد مقام ہے۔

مذہب خصوصاً مذہب اسلام کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ حکومتی سطح پر ایک طویل عرصہ سے کمیونسٹوں و لامذہبوں کے چنگل میں پھنسے ہونے کے باوجود اس شہر نے اپنی مذہب سے وابستگی کے رنگ کو کسی بھی طرح ہلکا نہیں ہونے دیا —— یہ الگ بات ہے کہ ارباب اقتدار نے اپنے ''خاص رنگ و آہنگ'' میں اور پھر ان کی کمک پر عام ''ظلمت پسند لوگ'' اپنے ظرف و حوصلہ کے مطابق کلکتہ کے مسلمانوں کی ''دینی غیرت'' کا وقتاً فوقتاً امتحان لیتے رہتے ہیں —— کبھی چاندمل چوپڑہ کی کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن مجید پر پابندی لگائے جانے کی درخواست کے ذریعہ، تو کبھی مسجدوں میں اذان کے لئے لگے لاؤڈ اسپیکروں کو ''صوتی آلودگی کا ذریعہ'' قرار دے کر اتارے جانے کے جبری احکام کے ذریعہ، اور کبھی ''وشال کولکتہ'' کی شاہراہوں کی تجدید و توسیع کی خاطر قدیم ترین مسجد کو مسمار کر دینے کے عزم بالجزم کے ذریعہ؟ —— اطمینان بخش بات یہ ہے کہ کلکتہ کے مسلمان خود کفیل بھی ہیں اور بیدار و ہوشیار بھی، اس لئے

اللہ کے بھروسے پر وہ ہر ''سرد و گرم'' کو جھیل کر اپنے مذہب کی حفاظت کرنے اور اس پر قائم رہنے کا قرینہ جانتے ہیں۔

ایک عشرہ پیشتر کلکتہ کا سفر ہوا، ایک دینی جلسہ میں شرکت اور کم و بیش ۲۶-۲۷/ گھنٹہ قیام کے بعد واپسی ہوگئی —— سفر نامے لکھنے کی نہ راقم الحروف کی عادت ہے نہ اس کا سلیقہ ہے، بکھری، بے رنگ، اور غیر اہم داستانِ زندگی، نہ حقیقتاً اس لائق ہے نہ ہی بفضل خدا اس لائق سمجھا کہ اسے ضبط تحریر میں لانے کے لئے کوئی اہتمام کیا جائے، بہت سے ''غیر اہم لوگ'' بھی شوقیہ طور پر اپنے شب و روز کی آپ بیتی کو ''داشتہ آید بکار'' سمجھ کر دوسروں کے لئے نہ سہی، اپنے ہی لئے محفوظ کر لیتے ہیں —— یہاں ایسا بھی کوئی شوق نہیں ہے۔ بلکہ اس سادہ سی حقیقت پر یقین ہے کہ ؎

ذکر بہار ہے نہ یہاں چاندنی کی بات
تم کیا کروگے سن کے مری زندگی کی بات

اس کے باوجود کبھی کوئی سفر ایسا بھی ہوتا ہے جس کی داستان میں لگتا ہے کہ دوسروں کے لئے بھی کچھ دلچسپی اور نفع بخشی کا سامان ہے، اور پھر تقاضا ہوتا ہے کہ اسے بیان ہی کر دیا جائے، کلکتہ کا پروگرام طے ہونے سے وہاں جانے تک، اور پھر جا کر واپس آنے تک، ایسا کوئی خیال نہیں تھا کہ اس سفر کا قارئین ''البدر'' کے سامنے کوئی ذکر کیا جائے —— یہ تو کئی روز کی بات ہے کہ کلکتہ کی ''انجمن اصلاح معاشرہ'' اس کی خدمات، دائرہ کار، اس کے پرجوش و باہوش ذمہ داروں کے طریق کار، اور پھر اس کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک بڑے اور کامیاب ''جلسہ اصلاح معاشرہ'' کی مختصر روداد لکھنے کا تقاضا ہوا، اور کئی بار اس خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش میں کامیابی نہ ملی تو کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا ہوں، اور اب رب العالمین سے التجا یہ ہے کہ اسے لکھنے والے اور پڑھنے والوں کے لئے کارآمد اور نفع بخش بنا دے۔ (آمین)

ہوا کچھ یوں کہ جامعہ قاسم العلوم خضرپور کلکتہ کے مہتمم جناب مفتی فخرالاسلام قاسمی صاحب نے پہلے فون پر اور پھر خود بہ نفس نفیس میرے غریب خانہ آکر جب مجھے ۱۴؍فروری ۲۰۰۵ء کو منعقد ہونے والے ''جلسہ اصلاح معاشرہ'' میں شریک ہوکر خطاب کرنے کی دعوت دی تو میں نے ملک کے طول وعرض سے اس عنوان یا اس سے ملتے جلتے عنوانوں پر منعقد ہوتے رہنے والے جلسوں ہی کی طرح ایک جلسہ سمجھ کر ابتداءً کچھ پس وپیش کیا اور پھر ''ایک مضبوط سفارش'' کے آنے بعد اپنی منظوری دے دی اور اس جلسہ میں شرکت کے لئے ۱۳؍فروری ۲۰۰۵ء کو ایک رفیق سفر کے ساتھ لکھنؤ سے روانگی کا پروگرام بنالیا۔ اور پھر مقررہ تاریخ میں لکھنؤ سے بذریعہ پنجاب میل روانہ ہوکر دوسرے روز صبح ۸؍بجے ہم لوگ ہاوڑہ اسٹیشن پہنچے۔ پھر اسٹیشن سے مولانا قمر عالم قاسمی صاحب کی معیت ورہنمائی میں بذریعہ کار جامعہ قاسم العلوم خضرپور کے لئے روانگی ہوئی۔

جامعہ قاسم العلوم کا قیام ۱۴۰۴ھ میں ہوا جس کے بانی ومہتمم مفتی فخرالاسلام صاحب ہی ہیں، خضرپور مسلمانوں کی گھنی آبادی کا ایک بڑا محلّہ ہے، ربع صدی پیشتر تک اہل ہوا وبدعت کا اس پورے علاقہ پر غلبہ وکنٹرول تھا اور اہل حق کا کوئی ایسا مرکز نہ تھا جہاں سے اجتماعی طور پر اس علاقہ کی اصلاح کے لئے کوششیں ہو پاتیں۔ بفضلہ تعالیٰ جامعہ قاسم العلوم نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا اور نہ صرف ایک دینی مدرسہ کا قیام عمل میں آیا بلکہ اس مدرسہ کے ذمہ داروں کی مخلصانہ محنتوں اور مدرسہ کی نسبت سے اکابر علمائے دیوبند کی آمدورفت، ان کے مواعظ، اور ان کی بافیض صحبتوں کے زیر اثر دینی بیداری اور صحیح اسلامی شعور کی ایک فضا بنی اور آج اسی مدرسہ کی برکت سے اہل حق کے لئے فضا اتنی سازگار ہے کہ اعلان واشتہار کے ساتھ مدرسہ کے قریب ایک کشادہ شاہراہ پر وہ عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں راقم الحروف کے علاوہ

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب دارالعلوم دیوبند، جناب مولانا عبداللہ صاحب اجراڑوی، اور جناب مولانا اسرارالحق قاسمی صاحب (دہلی) نے کثیر تعداد میں شریک ہونے والے حاضرین جلسہ کو خطاب کیا۔ جب کہ اسٹیج پر تقریباً دو درجن علماء وخطباء موجود تھے۔ اس موقع پر یہ کہنا مناسب بھی ہے اور حق بہ جانب بھی کہ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مفتی فخرالاسلام اور ان کے رفقاء مولانا معین الدین صاحب وغیرہ نے ایک ''تنظیم اصلاح معاشرہ'' کے نام سے قائم کررکھی ہے، جو صرف کاغذی تنظیم نہیں ہے بلکہ بتایا گیا کہ اس تنظیم کے تقریباً تین سو ممبر ہیں جن میں دوسو علماء، حفاظ اور ائمہ مساجد ہیں۔ تنظیم کے ذریعہ سے اہم کام یہ ہوتا ہے کہ ۱۰۵؍مسجدوں میں علمائے کرام درس قرآن دیتے ہیں، قرآن مجید سے براہ راست وابستگی سے بڑھ کر کوئی دینی شغل نہیں ہوسکتا ہے اور کسی ایک تنظیم کی طرف سے اتنی بڑی تعداد میں علماء کے ذریعہ درس قرآن کا اہتمام اس تنظیم کے بافیض اور کارآمد ہونے کے لئے کافی ہے۔ ویسے اس تنظیم کے ترجمان کی حیثیت سے ایک ماہانہ جریدہ بھی ''اصلاح'' کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ جس میں تنظیم کی کارگذاریوں وسرگرمیوں کی رپورٹ کے ساتھ ساتھ قیمتی واصلاحی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔

کلکتہ کے مختصر قیام کے دوران جامعہ قاسم العلوم کی ایک شاخ ''دارالعلوم رشیدیہ'' جانے اور وہاں کے طلبہ واساتذہ سے مختصر خطاب کا بھی موقع ملا۔ یہ مدرسہ ابھی ابتدائی منازل میں ہے، جو کہ دم دم ایئرپورٹ کے قریب راج باڑی نامی ایک گاؤں میں قائم ہے۔ اور مقامی بچوں کے علاوہ کچھ بیرونی طلبہ بھی رہتے ہیں۔ وہاں سے واپسی میں مولانا اسرارالحق صاحب قاسمی

کے طفیل میں کلکتہ بلکہ پورے صوبہ بنگال کی معروف و بافیض شخصیت حضرت
مولانا محمد طاہر صاحب مرحوم کے قائم فرمودہ ادارہ میں بھی حاضری کی سعادت
ملی۔ مولانا مرحوم شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے ممتاز
خلفاء میں سے تھے۔ اردو اور بنگلہ زبانوں میں ان کی متعدد اہم کتابیں ہیں
خصوصیت کے ساتھ ان کے بنگلہ زبان کے ترجمہ وتفسیر قرآن کو بڑی اہمیت
حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خالص ادبی نقطۂ نظر سے اس ترجمہ وتفسیر کو ایسی
قبولیت حاصل ہے کہ اسے بنگلہ زبان کے غیر مسلم ارباب ذوق بڑے شوق کے
ساتھ پڑھتے ہیں۔

مولانا مرحوم کا قائم فرمودہ ادارہ ''جامعہ مدنیہ'' کلکتہ ایئرپورٹ کے
نزدیک ہی اپنی وسیع وشاندار عمارات میں قائم ہے۔ جہاں دورۂ حدیث شریف
تک کی تعلیم کا باقاعدہ نظم ہے، اور تقریباً پانچ سو طلبہ دارالاقامہ میں مقیم ہیں۔
پرلطف بات یہ ہے کہ خود بانی ادارہ اور اساتذہ وطلبہ کی غالب تعداد کے بنگالی
ہونے کے باوجود یہاں کا ذریعہ تعلیم اردو زبان ہی ہے جس پر بانی ادارہ کو اس
قدر اصرار تھا کہ انہوں نے حدود مدرسہ میں اردو میں بات چیت اور درس
وتدریس کی پابندی لگا رکھی تھی۔

راقم الحروف کو اس کا احساس ہے کہ اس نے اپنے سفرنامہ میں کلکتہ کی
نیشنل لائبریری، فورٹ ولیم، ہاوڑہ برج، ہبلی برج، عجائب گھر، سی پورٹ، اور
ایڈن گارڈن وغیرہ وغیرہ جیسی کلکتہ کی قابل ذکر چیزوں کو نظر انداز کر کے ایسی
ہی چیزوں کا ذکر کیا ہے جن سے عام آدمی کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی —— تاہم اس
''ارادی کوشش'' کو راقم کی ''بدسلیقگی'' کے علاوہ اگر کوئی نام دیا جاسکتا ہے تو وہ
''ذوق ورجحان'' ہے۔ پھر یوں بھی راقم کا یہ سفر صرف ایک دینی واصلاحی جلسہ
میں شرکت کے عنوان پر ہوا تھا جس کے تعلق سے وہ اپنے اس سفر کو کامیاب کہہ
سکتا ہے۔ کیوں کہ کم وبیش ۵؍ گھنٹے تک جاری رہنے والے جلسہ میں تمام بولنے

والوں کی زبانوں سے وہی باتیں نکلیں جن کا رشتہ قرآن وحدیث سے ہونے کی
وجہ سے امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ اور اس کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی
پسندیدہ ہوں گی۔ اور اسے حق تعالیٰ کے خصوصی فضل وانعام کے بعد منتظمین
کے اخلاص کا ثمرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ منتظمین جلسہ کے بیان کے مطابق
شرکائے جلسہ میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو عقیدت مندانہ نہیں،
بلکہ ناقدانہ جذبات کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ لیکن جلسہ کے اختتام تک کسی
چہرہ سے بددلی اور کبیدگی تو کیا، ادنیٰ درجہ کی اکتاہٹ وبےزاری بھی مترشح
نہیں ہوئی —— بات یہیں تک نہیں بلکہ دیوبند سے نسبت رکھنے والے علماء کو
دیکھنے، مصافحہ کرنے، اور قریب ہونے کے لئے رات کے دو پہر گذر جانے
کے باوجود جس طرح ہجوم ہوا۔ اور بلا تفریق تمام چہروں میں بشاشت کا مشاہدہ
ہوا۔ اسے مقررین کے حسن بیان کے بجائے ان کی تقریر کی صحت اور ان کے
پیغام کی حقانیت سے تعبیر کرنا ہی حقیقت بھی ہے اور اظہار حقیقت بھی۔

کلکتہ کے اس سفر کی سب سے خوشگوار اور خوش آئند یادگار وہ ''تنظیم
اصلاح معاشرہ'' ہے، جس کے تمام ممبران واقفیت کی حد تک جواں سال بھی
ہیں اور جواں حوصلہ بھی، ان کے پاس منصوبے بھی ہیں، اور راہ عمل بھی ——
پھر کیوں نہ ہم ارحم الراحمین سے دعا گو ہوں کہ ان کو اخلاص کامل کی نعمت عطا فرما
کر ان سے اپنے خالص، بےمیل اور سچے دین کی خدمت لے لے۔ آمین)

اللہ بس، باقی ہوس۔

☆☆☆

قطر کا ایک سفر

میرے تیسرے نمبر کے بیٹے مولوی اسامہ عبدالاحد ندوی سلّمہٗ کا شدید اصرار تھا کہ ان کے والدین کچھ عرصہ کے لئے ان کے پاس دوحہ (قطر) پہنچ کر قیام کریں۔ جہاں وہ محکمہ اوقاف کی طرف سے ایک مسجد کی امامت اور تحفیظ القرآن کے ایک مدرسہ میں مدرس کے منصبوں پر فائز ہوکر ۲۰۰۸ء سے اپنی اہلیہ اور بچی کے ساتھ مقیم ہیں۔ (اب ماشاء اللہ ان کی دو بچیاں دانیہ و بریرہ، اور پھر ایک بیٹا ثمامہ سلمہم ہیں) چنانچہ کافی ٹال مٹول کے بعد مدرسہ کی سالانہ تعطیل کلاں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یکم جولائی ۲۰۱۳ء کو ہم دونوں اور چوتھے نمبر کے بیٹے سالم عبدالرحیم سلّمہٗ کی لکھنؤ سے روانگی ہوئی اور مسقط ایئرپورٹ پر کچھ دیر کنکٹنگ جہاز کے لئے قیام کرتے ہوئے اسی تاریخ میں ہم لوگ دوحہ پہنچ گئے۔ ایئرپورٹ پر اسامہ سلّمہٗ اپنے ایک دوست کے ساتھ موجود تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ دو کاروں میں سوار ہوکر چند منٹوں میں ہم اسامہ سلّمہٗ کے گھر پہنچ گئے۔

تین ہفتہ سے کچھ زائد کا یہ سفر اگرچہ بالکل نجی نوعیت کا تھا، لیکن اسے سوارت کرنے کے لئے میں نے اسامہ سلّمہٗ سے پہلے ہی یہ شرط لگادی تھی کہ وہاں تمہیں ہم لوگوں کو عمرہ بھی کرانا ہوگا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ان خلیجی ملکوں کے درمیان آمدورفت بہت آسان ہوگی، اور ہمارے ملک کے مقابلہ میں وہاں سے عمرہ کرنا بہت سہل ہوگا۔ مگر یہ تو وہاں جاکر علم ہوا کہ وہاں سے بھی ہمارے ملک ہی کی طرح ٹریولنگ ایجنٹ کے

ذریعہ ہی لوگ عموماً عمرہ کے لئے جاتے ہیں، اور جہاز کے علاوہ عام ذریعہ سفر لگژری بسیں ہیں جن سے سفر کرنے میں مکہ مکرمہ تک ۲۴؍گھنٹہ سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔ دوحہ سے مکہ کی مسافت بھی میرے قیاس و اندازہ سے کہیں زیادہ نکلی۔

لکھنؤ سے دوحہ روانہ ہوتے وقت میرا اپنا نظام یہ تھا کہ دوحہ پہنچنے کے بعد بس پہلے ہفتہ ہی میں عمرہ کے لئے جائیں گے اور وہاں سے واپس آکر اطمینان سے بچا ہوا وقت دوحہ میں گذاریں گے، مگر اسامہ سلّمہٗ کو چھٹی ملنے میں تاخیر ہوئی، جس کی وجہ سے دوسرے ہفتہ میں ہی جانا ہوسکتا تھا، اور جب چھٹی منظور ہونے کے بعد ٹریولنگ ایجنٹوں سے رابطہ کیا گیا تو یہ مایوس کردینے والی اطلاع ملی کہ اب ان کی تمام بسیں بک ہوچکی ہیں۔ اور رمضان کے آخری ہفتہ میں ہی کارواں کے ساتھ جانا ہوسکتا ہے، جب کہ ہمارا دوحہ سے واپسی کا سفر ۲۵؍جولائی یعنی وسط رمضان کا تھا۔ ابتدائی طور پر یہ تصور کرکے کہ عمرہ کے لئے جانا نہ ہوسکے گا، بڑی بے چینی و مایوسی ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ سعادت دارین سے سرفراز کرے میرے بیٹے اور بہو کو کہ ان لوگوں نے ہر طرح ڈھارس بندھائی اور اسامہ سلّمہٗ نے پورے اعتماد کے ساتھ یقین دہانی کرائی کہ ان شاء اللہ ہم لوگ عمرہ کے لئے ضرور جائیں گے چاہے اس کے لئے کوئی بھی جتن کرنا پڑے۔ کارواں کے ساتھ نہ بھی جاسکے تو ہم لوگ اپنی گاڑی سے یا پھر بس سے چلیں گے۔ چنانچہ انہوں نے کسی طرح بہت جدوجہد کے بعد ہم سب لوگوں کے لئے صرف ویزہ حاصل کیا (حالانکہ ٹریولنگ ایجنٹ نے پہلے سواری اور قیام و طعام کے ساتھ پورے پیکیج کا وعدہ کیا تھا۔ اور اسی کے انتظار اور وعدہ خلافیوں کی وجہ سے کئی دنوں کی تاخیر بھی ہوئی) پھر ہم سوا چار نفوس (ہم دونوں، بیٹا بہو، اور خردسال پوتی دانیہ سلمہا) پر مشتمل ہمارا چھوٹا سا قافلہ ۱۷؍جولائی کو ایک آرام دہ لگژری بس کے ذریعہ مکہ مکرمہ کے لئے براہ ریاض روانہ ہوا۔ رات

بھر کے سفر کے بعد دوسرے دن ہم لوگ سعودی دارالسلطنت ریاض کے بین الاقوامی بس اسٹیشن پہنچے۔ کئی گھنٹے آرام کرنے اور کھانے پینے کے بعد وہاں سے دوسری بس کے ذریعہ ہمارے سفر کی دوسری قسط شروع ہوئی۔ ریاض سے بھی مکہ مکرمہ کی مسافت ایک ہزار کلومیٹر سے زائد ہی ہے۔ وہ تو کہئے سعودیہ کی سڑکیں اتنی اچھی اور ٹریفک کا نظام اس قدر چست و درست ہے کہ اسی دن حرم کی عشاء کی نماز جماعت ہو چکنے کے بعد تاخیر سے ہم لوگوں کو مل گئی۔ مغرب کی نماز ہم لوگوں نے میقات کی مسجد میں ادا کی (یہ وہی میقات ہے جہاں سے حجۃ الوداع کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھا تھا) اور وہاں سے کچھ کھانے پینے کے بعد روانہ ہو کر نماز عشاء کے بعد ہم لوگ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ آرام دہ بسوں اور کشادہ سڑکوں کے باوجود اتنے طویل سفر کی تکان تھی، مگر ہم لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہمت دی، اور نماز عشاء اور پھر عمرہ کے ارکان طواف وسعی کی ادائیگی کے بعد ہی ہم لوگ اپنی مکہ مکرمہ کی عارضی قیام گاہ آئے۔ اور رات گئے کھانا کھانے کے بعد چند گھنٹے وہیں آرام کیا۔

مکہ مکرمہ میں تین روزہ قیام کے لئے ایک خلیق وملنسار پاکستانی الاصل محمد بخش صاحب کے رہائشی مکان کے ایک حصہ کو کرایہ پر حاصل کرنے میں، اور پھر دوران قیام کھانے وناشتے کی فراہمی کے سلسلہ میں ہمارے لکھنؤ کے بالکل خونی بھتیجہ کی طرح کا رشتہ رکھنے والے عزیز وقریب الحاج عزیز احمد نے جس طرح تعاون کیا، اس کے لئے قدم قدم پر دل سے دعائیں نکلتی رہیں۔

عزیزی حاجی عزیز احمد صاحب میرے بہت ہی بااعتماد اور بچپن کے دوست حافظ رفیق احمد صاحب کے حقیقی بھتیجے اور حاجی وحید احمد صاحب مرحوم کے بیٹے ہیں۔ حافظ رفیق احمد صاحب کی وجہ سے ان کے پورے گھر گھرانے کے تمام افراد سے بالکل خاندان کے جیسا تعلق رہا ہے۔ اور ان کے اعزہ نے جس کا جو رشتہ حافظ رفیق صاحب سے ہے وہی رشتہ مجھ سے بھی قائم کیا، اور

بفضلہ تعالیٰ اسے اب تک نباہتے چلے آرہے ہیں۔ اس طرح عزیز سے میرا چچا بھتیجے کا رشتہ ہے۔ مکہ مکرمہ میں ۳۵ ربرس سے زائد عرصہ سے قیام کی وجہ سے حاجی عزیز احمد مکہ کی ایک ایک گلی کوچے سے واقفیت رکھتے ہیں۔ پھر ان کا تعمیراتی کاموں کے ٹھیکے لینے کا کام ایسا ہے کہ مکہ کے اصل باشندوں اور وہاں مقیم باہری لوگوں سے ان کے خوب تعلقات ہیں۔ چوں کہ ان کو حق تعالیٰ نے خدمت گذاری کا جذبہ بھی عطا کیا ہے، اور اللہ کے گھر پہنچنے والے مہمانوں کی خدمت، عبادت وکار ثواب سمجھ کر بے لوث کرتے ہیں۔ پھر میرا معاملہ تو ''خصوصی زمرہ'' کا تھا، اس لئے میں نے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو قطر ہی سے بذریعہ فون اپنی مکہ مکرمہ آمد کی اطلاع دیتے ہوئے چند روزہ قیام کے لئے کسی رہائش گاہ کا انتظام کرنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہترین جزا عطا فرمائے کہ انہوں نے نہ صرف قیام وطعام کا بہترین انتظام کیا، بلکہ مکہ مکرمہ پہنچنے سے لے کر وہاں سے واپسی تک، رات کے چند گھنٹوں کے علاوہ پوری مدت قیام کے دوران ہم لوگوں کے ساتھ رہ کر ہمیں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ دونوں عمرہ، اور تقریباً تمام طوافوں میں بھی میرے گھٹنوں میں درد کی معذوری کی رعایت کرتے ہوئے میرا ساتھ دیا، اور ان کی واقفیت اور جذبۂ خدمت کے ساتھ رفاقت سے ہم لوگوں نے خوب نفع حاصل کیا۔

ہماری مکہ کی قیام گاہ کے مالک جناب بخش صاحب بھی بہت ہی بااخلاق اور مرنجان مرنج آدمی ثابت ہوئے۔ ہم لوگوں کی ان سے یہ پہلی، اور وہ بھی ایک مالک مکان اور کرایہ دار کی ملاقات تھی۔ لیکن صرف تین روزہ قیام کے دوران انہوں نے ہماری کھانے کی دعوت بھی کی، اور فرصت کے اوقات میں ہمیں اپنی دلچسپ گفتگو سے بھی شاد کام کیا۔ میری اہلیہ نے اوپر ان کی قیام گاہ پر ان کی اہلیہ صاحبہ سے بھی ملاقات کی اور ان کے پر خلوص رویے سے متاثر

ہوئیں ـــــ اور یہ سارا سلوک ہمیں صرف اور صرف اللہ کے گھر کا مہمان سمجھ کر کیا گیا۔ مکہ سے واپسی کے وقت بخش صاحب اتنے جذباتی ہو رہے تھے کہ جیسے ہماری برسوں کی ملاقات اور آپس میں گہرے مراسم ہوں؟۔ یقیناً اسی کا نام اخوت اسلامیہ ہے، جس کا ہم نے اس مبارک سفر کی برکت سے مشاہدہ کیا۔ اس مبارک سفر سے وطن واپسی کے بعد بھی کافی دنوں تک بخش صاحب اپنی پرخلوص شخصیت کے ساتھ یاد آتے رہے۔ اور عزیز میاں کے واسطہ سے ایک دو مرتبہ ان سے فون کے ذریعہ بات چیت بھی ہوئی۔ اللہ کرے وہ اب جہاں بھی ہوں عافیت کے ساتھ ہوں ـــــ اب تو ''میرے بھتیجے'' حاجی عزیز احمد بھی ایک طویل عرصہ ارض حرم میں رہ کر، اور وہاں کی ایمانی و پرکیف فضاؤں میں اپنی موجودہ عمر کا نصف سے زائد حصہ بسر کر کے کچھ اپنی علالت و کمزوری، اور اس سے بڑھ کر موجودہ حکومتی قوانین سے غیر ملکی لوگوں کے لئے ''تنگ ہوتی ہوئی زمین'' کی وجہ سے مستقل طور پر اپنے وطن لکھنؤ واپس آ چکے ہیں۔ ان کے ذریعہ کبھی کبھار بخش صاحب کی خیر خیریت معلوم ہو جایا کرتی تھی ـــــ اس کا سلسلہ بھی اب ختم ہو گیا۔ بہ ہر حال دعا ہے کہ حق تعالیٰ ان کے حسن سلوک کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ (آمین)

مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران جہاں عمروں، طواف، اور مسجد الحرام کی باجماعت نمازوں، نیز سید الائمہ شیخ عبدالرحمٰن السدیس کی اقتداء میں ان کی مسحور کن تلاوت قرآن کی سماعت کرتے ہوئے نماز تراویح کی بیس رکعتیں ادا کرنے کی سعادتیں حصہ میں آئیں۔ وہیں یہ حیرت انگیز منظر بھی سامنے آیا کہ محلوں کی دیگر مساجد میں عام طور پر تراویح میں آٹھ رکعتیں پڑھی جا رہی ہیں۔ حالاں کہ وہاں کے ائمہ و عام باشندے مسلکاً حنبلی ہیں، اور انہیں اپنے مسلک کی پابندی کرتے ہوئے بیس رکعت تراویح ہی پڑھنا چاہئے ـــــ جیسا کہ حرمین شریفین میں ہوتا ہے ـــــ پھر یہ تضاد کیوں؟ تمام مذہبی امور کی کڑی

نگرانی، اور مسلک کی ''غلو کی حد تک'' پابندی کرنے اور کرانے والی سعودی حکومت اور اس کے ذمہ داران کی اس طرف توجہ کیوں نہیں؟ ـــــ اسے کم از کم ''سہولت پسندی'' کے سوا اور کیا تعبیر دی جا سکتی ہے؟

اسے ''مسلکی توسع'' سے اس لئے نہیں تعبیر کیا جا سکتا کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کا اثر دوسری عبادات و مذہبی امور میں بھی نظر آتا ـــــ خصوصاً نماز عصر میں کہ وہ مثل ثانی شروع ہوتے ہی ادا کر لی جاتی ہے۔ جب کہ احناف کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق ابھی ظہر کا وقت ختم ہو کر عصر کا وقت آتا ہی نہیں ـــــ مگر حرمین شریفین کی نماز باجماعت پانے کی حرص میں احناف بھی اسی وقت نماز عصر ادا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ حالانکہ اگر کم و بیش ایک گھنٹہ تاخیر سے نماز عصر ادا کی جائے تو چاروں ائمہ کے مسلکوں پر عمل ہو جائے گا؟۔ اسی طرح عرفات کی مسجد نمرہ میں ''مقیم امام'' کے نماز ظہر میں قصر کرنے کا مسئلہ بھی ہے ـــــ جس کی وجہ سے مسائل سے واقفیت رکھنے والے تمام لاکھوں حنفی حجاج کرام جمع بین الظہر و العصر کی فضیلت حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں؟۔ مگر امام صاحب ان کی رعایت میں کم از کم ''اتنی زحمت'' بھی نہیں کرتے کہ ظہر کی نماز کا سلام پھیرنے کے بعد حنفی مقتدیوں کو اتنا ہی موقع دے دیں کہ وہ اپنے مسلک کے مطابق بقیہ دو رکعتوں کا اتمام ہی کر لیں، اس کے بعد امام صاحب عصر کی نماز ادا کرائیں؟ ـــــ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسائل کی جانکاری رکھنے والے حنفی حضرات مسجد نمرہ کی نماز باجماعت سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ زندگی میں کبھی کبھار ہی کسی خوش نصیب کو جمع بین صلوۃ الظہر والعصر کا جو موقع ملتا ہے اس سے بھی وہ فائدہ نہیں اٹھا پاتے، اور وہ اپنے اپنے خیموں میں نماز ظہر اس کے وقت میں اور نماز عصر اس کے وقت میں ہی ادا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ـــــ حالاں کہ اس کا حل بھی اس ''مسلکی توسع'' سے نکل سکتا ہے کہ عرفات کی مسجد میں یوم عرفہ میں ظہر و عصر کی نمازوں کو ادا

کرانے والے امام صاحب مقیم کے بجائے مسافر بن کر اپنے مسلک کے مطابق ہی دونوں نمازوں میں قصر کریں، لیکن ظہر اور عصر کے درمیان دو رکعت ادا کر لینے کا وقفہ دے دیں؟۔

بات آ جانے پر نماز تراویح کے سلسلہ میں ''دوہرے عمل'' کا ذکر صرف اس لئے کیا کہ ''مسلکی توسع'' اور چیز ہے ''تلفیق'' اور چیز ——— اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ سعودی ائمہ وارباب حل وعقد ''توسع'' نہیں بلکہ ''تلفیق'' سے کام لیتے ہیں ——— اور وہ بھی صرف اپنی سہولت وآرام طلبی کی خاطر ——— اگر ایسا نہیں ہے تو پھر حرمین شریفین کی مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں بیس رکعت تراویح کا اہتمام والتزام کیوں ہے۔ اور دیگر مساجد میں کیوں نہیں ہے؟

بہ ہر حال نماز تراویح اور اس کے متعلقات کا ذکر تو جملہ معترضہ کے طور پر آ گیا۔ ہمیں ہمارا مقصد سفر تو حاصل ہو ہی گیا، اور بہ فضل خداوندی ہم لوگون کو رمضان کے عمروں کی سعادت ملی، ساتھ ہی مسجد الحرام کی باجماعت نمازیں، طواف کعبہ، اور پھر وہاں کے افطار صوم کی برکتیں بھی حاصل ہو گئیں۔

تین دن قیام مکہ کے بعد ہم لوگ پرائیویٹ ٹیکسی کے ذریعہ دیار رسول مدینہ طیبہ کے لئے روانہ ہوئے اور کم وبیش چار سو کلو میٹر کا یہ سفر صرف ساڑھے تین گھنٹہ میں طے ہو گیا۔ (جس کا اپنے ملک میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا) یوں تو مدینہ طیبہ میں بھی اپنے ملک کے کئی شناسا حضرات موجود تھے، مگر کسی کو زحمت دینے کے بجائے یہاں کے دو روزہ قیام کے لئے بھی ہم لوگوں نے کرایہ پر کوئی کمرہ لینے کا فیصلہ کیا تھا، جس کے لئے اپنے ایک سعادت مند شاگرد مولوی محمد غالب صاحب کو پیشگی اطلاع دے دی تھی۔ چوں کہ مکہ سے مدینہ کے سفر کے دوران غالب سلّمہ کو اپنے پہنچنے کے تخمینی وقت کی اطلاع دے دی تھی اس لئے غالب سلّمہ ہمارے منتظر تھے۔ اور مسجد نبوی کے قریب ہماری ٹیکسی رکتے ہی

انہوں نے ہم سے ملاقات کی۔ وہ چوں کہ مدینہ منورہ میں بسلسلہ ملازمت کافی عرصہ سے مقیم تھے، اس لئے ان کو مسجد نبوی اور مدینہ منورہ سے کافی واقفیت تھی جس کا ہم لوگوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان ہی کے مشورہ پر سب سے پہلے ہم لوگ چند قدم کے فاصلہ پر واقع اپنی قیام گاہ گئے تاکہ اپنا ضروری سامان رکھنے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم لوگ نماز ظہر کی ادائیگی کے لئے مسجد نبوی میں حاضری دیں۔ اس دوران غالب سلّمہ، ہم لوگوں کے لئے وافر مقدار میں ناشتہ کا سامان بھی لے آئے اور ہم لوگوں نے شکم سیر ہو کر ناشتہ کیا اور انہیں ان کی سعادت مندی ومہمان نوازی پر دعائیں دیں۔ مدینہ طیبہ کی کوئی مخصوص عبادت نہیں ہوتی۔ بس حدیث نبوی کے مطابق پچاس ہزار نمازوں کے برابر اجر وثواب والی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں باجماعت نماز پنج گانہ کی ادائیگی اور انتظامیہ کی طرف سے مقرر کئے گئے اوقات میں روضہ اقدس پر حاضری دے کر صلوٰۃ وسلام کا نذرانہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ دو روزہ قیام کے دوران حق تعالیٰ نے اپنے کرم سے یہ سعادتیں عطا کیں۔ ریاض الجنۃ میں نوافل کی ادائیگی اور تلاوت قرآن مجید کی سعادتیں بھی حاصل ہوئیں، اور روضہ اقدس کے خدام خاص وجاروب کش خوش نصیب سعودی شیوخ کے خصوصی دسترخوان پر روزہ افطار کرنے کا موقع بھی میسر آیا۔

اللہ تعالیٰ بہترین اجر سے نوازے مولوی غالب کو کہ ان کی رہبری میں مسجد نبوی کے مخصوص مقامات پر نمازیں ادا کرنے، اور روضہ اقدس پر حاضری دے کر صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کے پرسکون مواقع ملے۔ نیز مدینہ منورہ میں قیام کے دوران اکثر کھانا وناشتہ، اور پھلوں کی ضیافت بھی ان ہی کی طرف سے رہی۔ و ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

حرمین شریفین میں چھ روزہ بابرکت قیام کے بعد ۲۴ر جولائی کو پھر اسی طرح بسوں کے ذریعہ سفر کرتے ہوئے بعد نماز عشاء ہم لوگوں کی دوحہ (قطر)

اسامہ سلّمہٗ کی قیام گاہ واپسی ہوئی۔ جہاں ایک شب و روز قیام کے بعد ۲۵ رجولائی کی رات کی فلائٹ سے روانہ ہوکر دوسرے دن صبح بہ عافیت تمام بہ حالت صوم ہم لوگوں کی لکھنؤ واپسی ہوئی۔ فله الحمد و الشكر۔

عمرہ کے اس سفر سے پہلے دو ہفتہ سے کچھ زائد عرصہ قطر میں فرزند صالح اسامہ سلّمہٗ کے گھر پر قیام رہا تھا۔ اس دوران خود اسامہ سلّمہٗ نے بھی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور ان کے کئی ہم پیشہ ہندوستانی دوستوں نے پر تکلّف دعوتیں بھی کیں۔ انہوں نے اپنے کئی عرب مقتدیوں سے بھی تعارف کے ساتھ ملاقاتیں کرائیں جنھوں نے اپنی ''گرم جوشانہ ملاقات'' سے إنما المؤمنون إخوة کا عملی طور پر احساس دلایا۔ دوحہ کے باہری ایریا کے صنعتی علاقہ کی ایک بڑی اور وسیع مسجد میں وہاں موجود بڑی تعداد میں ہندوستانیوں، پاکستانیوں، اور بنگلہ دیشیوں کے درمیان نماز جمعہ کے موقع پر میرا بیان بھی ہوا جسے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ سنا گیا۔

قطر ایک دولت مند، گیس اور تیل کے وافر ذخائر سے مالا مال چھوٹا سا خلیجی ملک ہے۔ اس میں بس ایک ہی شہر دوحہ ہے جو اس ملک کا دارالسلطنت بھی ہے۔ یہ شہری و مضافاتی دو حصوں میں تقسیم ہے، دونوں ہی حصوں میں شاندار عمارات، بہترین سڑکیں، وسیع وکشادہ مساجد، اور تجارتی مراکز ہیں۔ دیگر خلیجی ممالک کی طرح یہاں بھی ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش و دیگر ممالک کے شہری بڑی تعداد میں چھوٹی بڑی ملازمتوں کے سلسلہ میں مقیم ہیں جس میں مسلم وغیر مسلم سب ہی شامل ہیں اور انہیں دیگر کئی ممالک کے مقابلہ میں زیادہ سہولتیں ورعایتیں حاصل ہیں، اگرچہ ''حالیہ کرونا کی مارا ماری'' نے اس ملک پر بھی اپنے ناخوش گوار اثرات ڈالے ہیں، پھر بھی یہاں کی معیشت اب بھی بہت مستحکم ہے۔ قدرتی وسائل تیل وگیس کے علاوہ دیگر وسائل کی طرف بھی موجودہ حکمرانوں نے اب اپنی توجہ مبذول کرنا شروع کی ہے جسے ایک

''خوشگوار آغاز'' قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ ملک ایک جزیرہ کی طرح سمندروں سے گھرا ہوا ہے، یہاں ریلوے کا نظام نہیں ہے، ذرائع سفر ہوائی جہاز یا پھر سڑک کے راستے کی سواریاں کاریں وبسیں ہیں۔ سڑک کے راستے قریبی ملک سعودی عرب یا پھر بحرین کی سرحدوں سے گذر کر ہیں۔ تمام عربوں کی طرح یہاں کے باشندوں کو بھی لہوولعب خصوصاً فٹ بال کے کھیل سے خصوصی دلچسپی ہے —— جس میں دیوانگی کی حد تک یہ لوگ دلچسپی لیتے ہیں۔ عموماً یہاں کے لوگ امن پسند، خوش اخلاق اور مرنجان مرنج ہوتے ہیں —— ان سب کے باوجود ''عربی نسل پرستی'' کے ناپسندیدہ وغیر اسلامی جراثیم ان میں بھی پائے جاتے ہیں، اور جہاں تک ان کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اعلیٰ عہدوں ومناصب کے لئے عربوں کو ہی ترجیح دیتے ہیں —— یہ الگ بات ہے کہ ع

بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

ایک قابل ذکر سفر

سفر ہوتے ہی رہتے ہیں، سفر اندرون ملک کے بھی ہوئے اور بیرون ملک کے بھی، لیکن سفر نامہ لکھنے کا نہ مزاج ہے نہ ہی اس کا سلیقہ، بفضلہٖ تعالیٰ ''البدر'' کی اشاعت کا یہ چھتیسواں سال چل رہا ہے، ۳۵؍برس سے زائد کے اس عرصہ میں کشمیر کے پہلے سفر کا سفر نامہ ''گلزاروں کی وادی میں ۶ دن'' کے عنوان سے لکھ کر ہی شائع کرنا یاد ہے۔ دو برس پہلے کے سفر حج بیت اللہ کا سفر نامہ لکھنے کی تو بعض احباب نے اصرار کے ساتھ فرمائش بھی کی۔ کچھ ارادہ بھی کیا مگر پھر ہمت جواب دے گئی۔

میرے بیشتر اسفار دین کی نسبت ہی سے ہوئے۔ اور بعض اہمیت کے حامل اسفار کی روداد میں مجھے خود بھی افادیت کے کچھ پہلو نظر آئے، انہیں لکھ لکھا کر شائع کرنے کے لئے کبھی کبھی طبیعت میں ہُمک بھی پیدا ہوئی، مگر اپنی ''کم حیثیتی'' کا احساس ہوا تو افتادِ طبع نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس میں ''افادیت'' سے زیادہ ''خودنمائی'' کا پہلو غالب رہے گا —— اور بس ساری ہُمک سرد پڑ گئی؟ اس سے بحث نہیں کہ میرا ایسا کرنا، اور کرتے رہنا، مناسب تھا یا نا مناسب؟

یہ تمہید صرف اس لئے کہ ماہ رواں میں ایک ایسا سفر ہوا جس کے بارے میں کچھ لکھنے کا ارادہ ہوا اور اندازہ ہے کہ اس ارادہ میں کامیابی بھی ہو جائے گی —— سفر نامہ لکھنے اور پھر اسے شائع کرنے سے مزاجی ہم آہنگی نہ ہونے کی

وجہ سے یہ کوئی ''باقاعدہ سفر نامہ'' تو نہ ہو سکے گا، مگر جو کچھ ہو جائے گا اسے بھی میں انعام خداوندی ہی قرار دوں گا۔ کیوں کہ اس کا محرک ''عنوان سفر'' ہے، جس کے بابرکت و با مقصد ہونے سے انکار ممکن نہیں ہے۔

۳۱؍جنوری ۲۰۱۳ء کی شام سے شروع ہو کر ۵؍فروری ۲۰۱۳ء کی دوپہر میں تمام ہونے والے اس سفر میں مجھے اپنے فرزند اصغر مولوی معاویہ عبدالرحیم فاروقی سلّمہٗ استاد مدرسہ سیدنا بلالؓ لکھنؤ کی معیت حاصل رہی۔ یہ سفر ''مجلس تحفظ ختم نبوت آندھرا پردیش'' کے ذمہ داروں کی دعوت پر مجلس کی طرف سے منعقد ہونے والے ''عشرۂ تحفظ ختم نبوت'' کے کچھ جلسوں میں شرکت کے لئے ہوا تھا۔ اب اسے عنوان کی برکت کہئے یا پھر ارکان مجلس کے اخلاص، نظم و سلیقہ، اور جہد مسلسل کا ثمرہ کہ یکم سے ۴؍فروری ۲۰۱۳ء تک صرف چار روز کی قلیل مدت میں حیدرآباد، اور پھر وہاں سے ضلع نظام آباد کے کاماریڈی، بھیمگل، اور شہر نظام آباد۔ پھر وہاں سے حسن آباد منڈل ضلع کریم نگر، پھر ورنگل شہر، اور کھمم تک سات مختلف اور دور دراز مقامات پر پہنچ کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دین و دعوت کے سلسلہ میں اپنی بساط کے مطابق کچھ عرض کرنے کے مواقع بھی ملے، اور قادیان کے خودساختہ اور جعلی مدعی نبوت کے تار و پود بکھیرنے کی سعادت بھی حاصل ہو گئی۔

میرے خیال میں اسے ''دنیا کا آٹھواں عجوبہ'' کہئے کہ علم و دانش کے اس ''تشہیری دور'' میں بھی دور جہالت سے ''جذباتی و جسمانی رشتہ'' رکھنے والے کچھ ایسے ''انسان نما جاندار لوگ'' موجود ہیں جو مرزا غلام احمد قادیانی جیسے ''چوتھے درجہ کے جاندار'' کو نبی مان کر اپنے آپ کو اس کا امتی کہلانا پسند کرتے ہیں؟ فیاحسرتاً علی العباد۔

مجھے آندھرا پردیش اور اس کے خطۂ تلنگانہ کے اس حالیہ ہنگامی دورہ سے احساس ہوا کہ ایسے خرد بیزار لوگوں کی یہاں اچھی خاصی تعداد ہے، جس کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ''مجلس تحفظ ختم نبوت آندھرا'' کے مخلص کارکنوں

اوران کی سرپرستی کرنے والے علمائے کرام کی سعی پیہم سے کم وبیش دس برس کے عرصہ میں پانچ ہزار سے زائد مرتد ہوجانے والوں کو دوبارہ اسلام کے دامن رحمت اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتۂ غلامی سے وابستہ کیا جاچکا ہے۔ جب کہ بعض مقامات پر اب بھی وہ مزاحمت کرنے کی تعداد میں موجود ہیں؟

یوں تو فرنگی سرپرستی میں جنم لے کر پروان چڑھنے والا یہ زیرزمین ''فتنۂ قادیانیت'' دنیا کے دیگر متعدد ممالک کے ساتھ ہی ہمارے اپنے ملک کے مختلف علاقوں میں بھی کسی نہ کسی روپ میں موجود ہے، لیکن اپنی ''جنم بھومی'' برطانیہ، خصوصاً اس کی راجدھانی لندن میں تو ''اپنا گھر'' ہونے کی وجہ سے یہ ''برہنہ انداز'' میں موجود ہے۔ بقیہ دوسرے مقامات خصوصاً ہمارے ملک کے بیشتر مقامات پر ''منافقت کے خیموں'' میں پناہ لے کر ہی اکھڑی اکھڑی سانسیں لینے پر مجبور ہے —— خود ہمارے اپنے علاقہ کے اندر بڑی آبادیوں سے ہٹ کر ایسے کوردہ مقامات میں پہنچ کر نقب لگانے کی کوشش کی جاتی ہے جہاں مسلمان تعداد کے اعتبار سے بھی کم ہوں، اور دینی تربیت سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ مالی اعتبار سے بھی کمزور ہوں؟

مرزا قادیانی کی ''کرم بھومی'' پنجاب کے بارے میں تو مجھے تفصیلی واقفیت نہیں ہے، البتہ ملک کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں آندھرا پردیش میں مجھے قادیانیت زیادہ ''عریاں'' نظر آئی —— تاہم اطمینان بخش بات یہ ہے کہ اس کا تعاقب کرکے اسے اس کے کیفر کردار تک پہنچانے کا انتظام بھی ماشاءاللہ اسی انداز میں معقول ومنظم ہے۔ حیدرآباد کی سہ منزلہ عمارت میں قائم مرکزی دفتر کے ساتھ ہی متاثرہ تقریباً تمام ہی علاقوں میں ''مجلس تحفظ ختم نبوت'' کے باقاعدہ دفاتر قائم ہیں، جہاں ضروری اور اہم کتابوں پر مشتمل لائبریریاں بھی ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً لٹریچر اور رمضان و دیگر مواقع پر اشیائے خوردونوش کی بڑے پیمانے پر تقسیم کا بھی نظم ہے۔

اسی مختصر چلتی پھرتی مدت قیام کے دوران مجلس سے وابستہ جن علماء وزعماء سے مجھے ملاقات کا موقع مل سکا ان میں صدر مجلس حضرت مولانا شاہ جمال الرحمٰن مفتاحی، حضرت مولانا غیاث الدین قاسمی، حضرت مولانا محمد ارشد قاسمی، حضرت مولانا مفتی عبدالمغنی مظاہری، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب، جناب مولانا محمد ابرار صاحب، جناب مولانا انصارالرحمٰن صاحب، جناب مولانا محمد ایوب صاحب، حافظ نصیرالدین حسامی صاحب، اور روزنامہ ''اعتماد'' حیدرآباد سے وابستہ صحافی عبدالوحید گلشن صاحب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر علماء وزعماء سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا، مگر ان کے نام مجھے یاد نہیں رہ گئے۔ ''مجلس تحفظ ختم نبوت'' کے بینر سے قادیان کی ''دیسی اور ولایتی آمیزہ سے ساختہ'' جعلی نبوت کی بیخ کنی کرکے سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ''تاج ختم نبوت'' کی حفاظت کا بیڑہ اٹھانے والوں میں علماء اور خواص کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی بھرپور ایمانی جوش وخروش دیکھنے کو ملا۔ یہی وجہ ہے کہ دیہی اور شہری دونوں علاقوں کے جن جلسوں میں مجھے شرکت کرنے کا موقع ملا وہاں ''بلاتفریق وفاداری دیگر'' صرف اور صرف خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر مشروط نسبت غلامی کے نام پر بڑی تعداد میں عوام وخواص کی موجودگی رہی، جو اس ''دورِ تحزب وخودنمائی'' میں بجائے خود ایک فال نیک اور کارکنوں کے اخلاص کی ایک شہادت ہے۔ والعلم عنداللّٰہ و اجرہ علیہ۔

جہاں تک ''قادیانی نبوت'' کی بے حقیقتی کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں ہمارے اکابر واسلاف ہی نے اس قدر دلائل وشواہد بہم پہنچادیئے ہیں کہ سیم وزر کی لالچ میں اس سے وابستگی رکھنے والے بھی ''اپنی حقیقی شناخت'' کے ساتھ نہ اپنے کو مسلمان کہہ سکتے ہیں، نہ ہی حرمین شریفین میں حاضری دے سکتے ہیں، نہ ہی پیغمبر آخر وخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں سے روبرو ہوکر ان سے اجتماعی یا انفرادی ملاقاتیں کرسکتے ہیں، اور نہ ہی ان کے قبرستانوں میں اپنی ''متعفن

لاشیں'' دفنا سکتے ہیں ـــــ کیوں کہ امت مسلمہ کا اجماعی فیصلہ ہے کہ یہ
باغیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف کافر بلکہ مرتد ہیں۔

پیغمبر ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی ردائے نبوت سے خس وخاشاک
پاک کرنے کے عنوان کی برکت سے مجھے جو عرض کرنے کی توفیق ملی وہ تو
میرے لئے ذریعہ سعادت ہے ـــــ لیکن ''تحدیث نعمت'' کے طور پر اپنی
اس مسرت کے اظہار کے لئے مضطر ہوں کہ میرے جواں سال فرزند مولوی
معاویہ عبدالرحیم فاروقی سلّمہٗ نے بھی اس کاروان سعادت میں اپنی مضبوط و
مستحکم حاضری درج کرائی۔ فللّٰہ الحمد ولہ الشکر۔

عزیز موصوف دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فاضل ہیں اور انہوں نے
درجۂ فضیلت میں تخصّص کے لئے حدیث پاک ہی کا انتخاب کیا تھا، اور اب وہ
ماشاءاللہ لکھنؤ کے ایک مدرسہ سیدنا بلالؓ میں دیگر فنون کے ساتھ خصوصی طور پر
تدریس وخدمت حدیث میں مشغول ہیں۔ چونکہ انہیں عربی اور انگریزی دونوں
زبانوں میں بھی اچھی دسترس حاصل ہے اس لئے ان کی مختصر لیکن پر مغز تقریریں
سامعین خصوصاً نوجوان طبقہ نے دلچسپی کے ساتھ سنیں۔ مجھے مسرت اس وجہ
سے ہوئی کہ انہوں نے ''تحفظ ختم نبوت'' کے خاص موضوع کے لئے اچھی تیاری
کرکے اپنی تقریروں میں اچھا اور باسلیقہ مواد پیش کیا جس کی اس میدان کے
شناوروں نے بھی تحسین کی۔ حق تعالیٰ ہمارے اس سفر سعادت کو قبول فرمائے۔
ہماری بے مائیگی کے باوجود اپنے حبیب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت
سے ہماری جاروب کشی کو امت مسلمہ کے لئے مفید ونفع بخش بنا کر ان کے عقائد
حقہ کی حفاظت وصیانت کا وسیلہ بنائے۔ اور ہمارے ان داعیوں ومیزبانوں کو
اپنے ذخیرۂ بے بہا سے بھرپور صلہ عطا فرمائے جو اصلاح عقائد کی اس مبارک
مہم میں ہماری شرکت وشمولیت کا ذریعہ بنے۔

و ما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت و الیہ انیب

ایک سفر اپنوں کے لئے

کاندھلہ ضلع مظفرنگر (یوپی) ایک ایسی بستی ہے جس کا نام اس کے
فرزندوں کی بدولت ملک کی سرحدوں کو عبور کرکے دور دور تک پہنچ چکا ہے۔ مفتی
الٰہی بخشؒ اور مولانا نورالحسنؒ والے کاندھلہ کو نہ بھی سہی تو بھی ہمارے ملک کا کون
اسلامی کلمہ گو بانی جماعت تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، شیخ الحدیث
حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ، مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور حضرت مولانا
انعام الحسن صاحبؒ کے کاندھلہ کے نام سے واقف نہ ہوگا؟

دین اور علوم دین کے حوالہ سے کاندھلہ کل بھی ایک اہمیت کا حامل
مقام تھا اور بفضلہ تعالیٰ آج بھی ہے ـــــ اور مجھے خوشی ہے کہ آج کے
کاندھلہ کی قابل ذکر شخصیتوں میں سے ایک مولانا نورالحسن راشد صاحب کو میں
بھی ''اپنا'' کہہ سکتا ہوں۔

مولانا نورالحسن راشد صاحب آج تو ماشاءاللہ اپنے سہ ماہی رسالہ
''احوال وآثار'' اور اپنی قائم کردہ ''مفتی الٰہی بخش اکاڈمی'' ہی کے ذریعہ نہیں،
بلکہ اپنے علمی وتاریخی مضامین وکتب اور اپنے ''کھوجی قلم'' کے ذریعہ بھی اپنی
ایک شناخت بنا چکے ہیں ـــــ لیکن ان سے میرا رشتہ اس وقت سے ہے
جب وہ یہ سب کچھ نہ ہوکر صرف نورالحسن راشد ہوا کرتے تھے۔

بات ایک تہائی صدی پرانی ہوچکی کہ نورالحسن راشد مدرسہ مظاہر علوم
سہارنپور میں اور عبدالعلی فاروقی دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کررہے تھے،

اس کے باوجود دونوں کے درمیان ''دوستی کا رشتہ'' تھا۔ خط وکتابت بھی ہوتی اور ایک دوسرے سے ملاقات کے لئے آنا جانا بھی ہوتا —— اسی دوران ایک مرتبہ راشد کے گھر کاندھلہ جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ طالب علمی کے اس دور میں ہم دونوں کے چند اور بھی ''مشترک دوست'' تھے اور سب نے مل کر باقاعدہ اور منظّم طور پر راشد کے گھر پر ''دھاوا'' بولا تھا، لیکن چوں کہ راشد اس کے لئے پہلے سے تیار تھے اس لئے خوب خاطر مدارات ہوئی اور کافی دنوں تک دوستوں میں اس پر لطف سفر کا چرچا رہا۔

پھر ۱۳۹۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کی رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد گویا ''پنجڑے کی پھٹکی'' کھل گئی اور ہر پرندہ نے اپنی راہ لی —— دوستوں کے اس گروپ کے تمام ہی افراد (بشمول مولانا نورالحسن راشد) آج ماشاء اللہ اپنے اپنے حلقہ ومیدان میں اتنے بلند مقام پر فائز ہیں کہ ان کا نام لے کر ان سے دوستی کا حوالہ دوں تو ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ اسے ''اپنا قد اونچا کرنے'' سے تعبیر کریں —— اس لئے بس اس اظہار تمنا ہی پر اکتفا ہے کہ ۔

اے کاش کہ وہ دن واپس آتے

ایک طویل عرصہ گذرنے کے بعد ابھی اسی ماہ میں کاندھلہ کا دوسری مرتبہ سفر ہوا —— اور حسن اتفاق یہ کہ یہ سفر بھی مولانا نورالحسن راشد کی دعوت پر اور ان ہی کے لئے ہوا۔

حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کی دعوت واصرار پر مدرسہ نعیمیہ عزیزیہ ٹھکاہا مجھول ضلع سیتامڑھی کے جلسۂ دستار بندی میں شرکت کے لئے صوبہ بہار کے پر صعوبت سفر سے یکم اپریل ۲۰۰۱ء کو گھر واپس آتے ہی اطلاع ملی کہ کاندھلہ سے نورالحسن راشد صاحب کے کئی فون آچکے ہیں —— میں اسی وقت سمجھ گیا کہ کئی ہفتہ پہلے آئے ہوئے جس دعوت نامہ کو میں نے ''رسمی'' قرار دے کر کوئی ''نوٹس'' نہیں لیا ہے، اسے شاید نظر انداز نہ کرسکوں گا —— اور

راشد صاحب کے یہ فون اسی سلسلہ میں ہیں۔

دوسرے ہی دن یعنی ۲/اپریل کو نماز فجر کے کچھ ہی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی اور مولانا نورالحسن راشد مجھ سے مخاطب تھے —— وہی مانوس سا لب ولہجہ اور وہی شکوہ وشکایت کے انداز، اور پھر آخر میں یہ ''تاکیدی حکم'' کہ ۱۲/اپریل کی پہلی نشست میں تو تم کو شریک ہونا ہی ہے۔

میں نے دریافت کیا کہ ہونا کیا ہے؟ اور میرا کیا کام ہے؟

جواب ملا کہ حضرت نانوتویؒ پر جس کتاب کا آپ لوگوں نے ''امام محمد قاسم النانوتوی سمینار'' (منعقدہ مئی ۲۰۰۰ء بمقام دہلی) کے موقع پر باصرار تقاضا کیا تھا، اس کی اشاعت ہوگئی ہے —— اس کا اور کچھ دوسری کتابوں کا اجراء ہونا ہے، ایک مدرسہ کا سنگ بنیاد، اور پھر ایک جلسۂ عام بھی پروگرام میں شامل ہے۔ آپ کو بس آنا ہے، باقی یہاں آنے پر دیکھا جائے گا۔

۱۱/اپریل ۲۰۰۱ء کی شب میں ''سدبھاؤنا ایکسپریس'' سے جب میں کاندھلہ کے لئے براہ بجنور روانہ ہوا تو میرے ذہن میں ''تقریب رسم اجراء'' کا یہ خیالی نقشہ تھا کہ چند مخصوص اہل علم حضرات کا ایک مختصر اور نمائندہ جلسہ ہوگا جس میں مولانا راشد صاحب کی اس کتاب کے ''کچھ فضائل ومناقب'' بیان ہونے کے بعد کسی بزرگ کے ہاتھوں اس کی ''رونمائی'' ہوجائے گی۔ اور میں نیز میرے ہی جیسے کچھ دوسرے لوگ اس کے گواہ ہوجائیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلّا —— مگر کاندھلہ پہنچ کر علم ہوا کہ یہاں تو باقاعدہ قسم کا ایک ''اجتماع'' ہو رہا ہے۔ صبح کی جس ''خصوصی نشست'' میں میری شرکت ہوئی اس کے شرکاء کی تعداد ۱۵-۱۶/ہزار بتائی گئی جب کہ شام کو بعد نماز مغرب منعقد ہونے والے ''جلسہ عام'' کے متوقع شرکاء کا تخمینہ ۵۰-۶۰/ہزار لگایا گیا تھا۔

ہمارے صوبہ اتر پردیش کے مغربی دیار کے عوام کا یہ ذوق لائق تحسین بھی ہے اور قابل رشک بھی کہ دین کے نام پر ان کو دعوت دی جائے تو اسی طرح

جھنڈ کے جھنڈ نکل کر جمع ہو جاتے ہیں۔

میں اور میری ہی طرح دوسرے بہت سے لوگوں کے لئے کسی ایک کتاب کی رسم اجراء کے لئے منعقد ہونے والی تقریب میں اتنی بڑی تعداد میں نہ صرف عوام بلکہ خواص اور ''اخص الخواص'' کا جمع ہونا اور پھر کئی گھنٹوں تک پورے سکون و دلجمعی کے ساتھ کہنے والوں کی سنتے رہنا، بہر حال ایک نیا اور عجوبہ منظر تھا —— میرا یہ کہنے کا جی چاہتا ہے کہ اس میں حضرت نانوتوی کی شخصیت، کاندھلہ کی سرزمین اور دینی اداروں کے فیوض کے ساتھ ساتھ ''کچھ نہ کچھ'' تو ہمارے مولانا نورالحسن راشد کی صلاحیتوں کا بھی اثر ہوگا ہی۔

علم وعلماء کے اس علاقہ کے ''اسٹیج نشینوں'' کے بارے میں کہنا ہی کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ علماء وصلحاء اور افاضل واکابر کی ایک کہکشاں سجی ہوئی تھی، چنانچہ مولانا نورالحسن راشد کے والد ماجد حضرت مولانا افتخار الحسن صاحب کے علاوہ حضرت مولانا محمد یونس صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، مولانا عبدالقدوس رومی صاحب، مولانا زین العابدین معروفی صاحب، مولانا زبیرالحسن صاحب (امیر جماعت تبلیغ) مولانا عمار احمد (الٰہ آباد) مولانا عمید الزماں کیرانوی صاحب، مولانا فضیل احمد صاحب، مولانا سجاد نعمانی صاحب، مولانا سلمان حسینی صاحب، اور مکہ مکرمہ سے آئے مہمان خصوصی مولانا محمد حشیم صاحب (مدرسہ صولتیہ والے) نیز دارالعلوم دیوبند و مظاہر علوم سہارنپور کے اساتذہ کرام کے علاوہ دیگر مدارس کے ذمہ داران و اساتذہ درجنوں کی تعداد میں موجود تھے —— علماء واکابر کے اتنے بڑے اجتماع کو میرے خیال میں ''علمی کہکشاں'' کی تعبیر دینا ہی مناسب ہوگا۔ مولانا نورالحسن راشد کی تازہ بہ تازہ نو بہ نو کتاب ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ —— احوال وآثار و باقیات ومتعلقات'' (پورا نام کتاب دیکھ کر ہی لکھا ہے امید ہے کہ کچھ عرصہ کے

بعد یاد ہو جائے گا) کی ''رسم اجرا'' کتاب کے مرتب نے اپنے مزاج کے مطابق ''نئے ڈھنگ'' سے اس طرح انجام دی کہ اسٹیج نشینوں میں سے کچھ لوگوں کو ''اپنی صوابدید وانتخاب'' کے مطابق ایک ایک نسخہ عطا کر دیا —— اور بس ہو گیا کتاب کا اجراء۔ میں خوش نصیب تھا کہ ایک نسخہ میرے حصہ میں بھی آیا مگر اس ''سرگوشی'' کے ساتھ کہ ''آپ کیا کریں گے کتاب لے کر؟'' یعنی؟

—— یہ نسخہ ضائع تو ہو رہا ہے مگر —— ع

جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

پونے آٹھ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کے اندر کیا ہے؟ اس پر تو ان شاء اللہ بعد میں کچھ روشنی ڈالنے کا ارادہ ہے، لیکن اگر صرف اس کے صفحات، معکوسات، حوالہ جات اور ظاہری حسن و جمال ہی پر نظر کی جائے تو بھی اسے ''قیمتی کتاب'' تسلیم کر لیا جائے گا —— اور ایسی کتاب کا مصنف (جو خود ہی اس کا ناشر بھی ہو) اگر قدرے استغناء یا بخل سے کام لے تو اسے عیب سے زیادہ ''مجبوری'' سے تعبیر کیا جانا چاہئے۔

رسم اجراء کے سلسلہ میں منعقد ہونے والی اس ''خصوصی نشست'' یا ''عظیم الشان جلسہ'' کی نظامت مولانا محمد رضوان قاسمی نے کی (ان کی موجودگی میں ان سے زیادہ موزوں ناظم جلسہ یا ''اناؤنسر'' ہوتا بھی کون؟) مولانا رضوان صاحب دھیرے دھیرے ''باقاعدہ اور معتبر قسم کے'' ناظم جلسہ ہوتے جا رہے ہیں جس کا ثبوت ان کا شستہ انداز نظامت ہی نہیں، یہ بھی ہے کہ مدت جلسہ کے کل وقت میں سے کم از کم ایک تہائی پر وہ اپنا حق سمجھ کر اسے بخوبی استعمال کرتے ہیں —— اور یہ بھی ان کے باشعور و پختہ کار اناؤنسر یا ناظم جلسہ ہونے کا ایک ثبوت ہے۔

یوں تو تین گھنٹہ سے زائد چلنے والے اس جلسہ میں کئی نظموں کے علاوہ متعدد بلکہ بہت سی تقریریں ہوئیں اور اسی ''ریلے'' میں مولانا راشد صاحب کی

خواہش واصرار پر مجھے بھی گذار دیا گیا —— مگر میرے خیال میں مرکزی اور قدرے مفصل تقریر مولانا ارشد مدنی صاحب کی ہوئی جنہوں نے ''فکر قاسمی'' اور دینی مدارس خصوصاً دارالعلوم دیوبند کو عنوان کلام بنا کر موثر و دل پذیر باتیں کہیں اور مولانا زبیرالحسن صاحب کی دعا پر اس نشست کا اختتام ہوا۔

اس جلسہ میں شرکت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ اکابر و مشائخ کے علاوہ نہ جانے کب کب کے چھوٹے ہوؤں سے بھی ملاقاتیں ہوگئیں —— جنہوں نے توجہ دے کر ممنون کیا، اور برسہا برس کے بعد ان سے اس ملاقات نے ماضی کی بہت سی یادیں تازہ کردیں۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

اس سفر کا اصل نشانہ تو کاندھلہ ہی تھا مگر اس کا قطعی پروگرام طے ہوتے ہی اس کی اطلاع برادر عزیز جناب محمد یامین قاسمی صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند کو (جو ان دنوں لکھنؤ ہی میں مقیم تھے) ہوگئی اور انہوں نے فوراً فون کر کے مجھ سے کہا کہ کاندھلہ سے میرا وطن سونتہ رسول پور قریب ہی ہے، میری خواہش ہے کہ کاندھلہ کے پروگرام میں شرکت کر کے رات آپ سونتہ میں ہی گذاریں اور اس کے لئے میں اپنا پہلے سے طے شدہ پروگرام تبدیل کر کے آپ کے ساتھ ہی کاندھلہ اور وہاں سے سونتہ جانے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے عذر پیش کیا کہ مجھے دیوبند بھی جانا ہے اور لکھنؤ کی واپسی بھی انشاء اللہ دوسرے روز ہی ہونا ہے۔ انہوں نے یقین دہانی کرائی کہ سب کچھ بروقت ہوجائے گا، آپ بس سونتہ کا پروگرام بنالیں۔ اور پھر میرے وعدہ کے بعد مولانا محمد یامین صاحب نے اپنا پہلے سے طے شدہ پروگرام تبدیل کر کے لکھنؤ سے میرے ہمراہ ہی سفر کیا اور ہم دونوں (بلکہ مولانا سلمان اور مولانا سجاد صاحبان بھی) ایک ساتھ ہی کاندھلہ پہنچے تھے۔

مولانا محمد یامین قاسمی صاحب دارالعلوم دیوبند میں مبلغ مقرر ہونے سے

پہلے کئی برسوں تک دارالمبلغین لکھنؤ میں رہ چکے ہیں اور ازراہ شرافت میرے ساتھ اپنے ''بڑوں کا سا'' معاملہ کرتے ہیں —— انہوں نے متعدد بار اپنے گاؤں کے اس ''مکتب'' کا ذکر کیا تھا جس کے وہ ناظم ہیں اور اس سفر میں غالباً وہ اپنے گھر سے زیادہ اپنا ''مکتب'' ہی مجھے دکھانا چاہتے تھے۔

کاندھلہ کے اصل پروگرام میں میری شرکت ہو ہی چکی تھی اس لئے بعد نماز عصر میں نے مولانا نورالحسن راشد صاحب سے واپسی کی اجازت حاصل کرلی اور پھر ہم لوگ بذریعہ کار سونتہ رسول پور کے لئے روانہ ہوگئے۔ نماز مغرب ایک درمیانی بستی کی مسجد میں ادا کی گئی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ سونتہ کے اس ''مکتب'' میں پہنچ گئے جس کا ذکر بہت پہلے سے سن چکے تھے یہ دیکھ کر اور جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اچھے خاصے ''مدرسہ عربیہ مدینۃ العلوم'' کو مولانا محمد یامین صاحب ازراہ انکسار ''مکتب'' کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ خوبصورت اور سلیقہ سے بنی ہوئی اچھی خاصی وسیع عمارت کے علاوہ زیر تعمیر عمارت، اور پھر اس سے بھی زیادہ افتادہ زمین اور اس پر مستقبل کے تعمیری منصوبے، نیز صاف ستھرا اور پرسکون ماحول، ہر چیز پکار کر کہہ رہی تھی کہ یہ ''مکتب'' ہی نہیں متوسط درجہ کا ایک باقاعدہ مدرسہ ہے۔

رات کا وقت اور وہ بھی ''شب جمعہ'' ہونے کی وجہ سے چند طلبہ واساتذہ ہی سے ملاقات ہوسکی کیوں کہ جوار کے اساتذہ وطلبہ ''تعطیل جمعہ'' گذارنے کے لئے اپنے اپنے گھروں کو جاچکے تھے۔ جو لوگ بھی ملے اتنے خلوص ومحبت کے ساتھ ملے کہ ان سے مل کر ''پہلی ملاقات'' کا اندازہ ہی نہ ہوسکا۔

رات بڑے سکون کے ساتھ اور میٹھی نیند سو کر مدرسہ ہی میں گذاری —— پھر صبح کو مولانا محمد یامین صاحب نے اپنے مکان لے جا کر بہت ہی پرتکلف قسم کا ناشتہ کرایا جس میں گاؤں کے چند معززین بھی شریک تھے۔

مولانا محمد یامین صاحب نے ضیافت وشرافت کا حق ادا کرتے ہوئے یہ سلوک بھی کیا کہ اپنی کار کے ذریعہ میرے دیوبند تک پہنچنے کا انتظام کردیا اور رہبر کے طور پر اپنے بیٹے عبداللہ سلّمہٗ (متعلّم دارالعلوم) کو بھی ہمراہ کیا ـــــــ اس طرح ۱۳؍اپریل بروز جمعہ دن میں ۱۱:۳۰ بجے ہم لوگ دارالعلوم دیوبند پہنچ گئے۔

دارالعلوم میں اس وقت میرے دو بچے حارث عبدالرحیم سلّمہٗ اور اسامہ عبدالاحد سلّمہٗ ایک بھتیجہ یاسر عبدالرحیم سلّمہٗ، ایک بھانجہ سعید اطہر سلّمہٗ اور ایک پھوپھی زاد بھائی محمد عثمان سلّمہٗ زیر تعلیم ہیں۔ دیوبند جانے کی اصل غرض تو ان بچوں سے ملاقات ہی تھی کیوں کہ انہیں اس سفر کی اطلاع ہونے کی وجہ سے میرا انتظار تھا۔ مگر وہاں پہنچ کر یہ علم ہوا کہ میری آمد کی پیشگی اطلاع پاکر شعبہ مناظرہ کے طلبہ نے اس دن کے لئے مجھے بحیثیت حکم مقرر کرکے اس کا باقاعدہ اعلان واشتہار بھی کردیا ہے۔

یہ پروگرام حسب معمول بعد نماز جمعہ ہونا تھا جب کہ میری مجبوری یہ تھی کہ اسی روز نوچندی ایکسپریس سے لکھنؤ واپسی کے لئے میرا ریزرویشن تھا۔ طے یہ پایا کہ پروگرام معمول سے کچھ پہلے ہی شروع کرکے کچھ پہلے ختم بھی کردیا جائے۔ مگر میری معذرت کے باوجود طلبہ نے مجھے عدم شرکت کی اجازت نہیں دی۔

طلبہ کی اس ''تمرینی مناظرہ'' کا عنوان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عقیدۂ ''حاضر وناظر'' کا اثبات یا ابطال تھا۔ اور اس کے لئے ایک گروپ ''رضاخانی'' اور دوسرا ''دیوبندی'' بنا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ حق پر کون تھا؟ باطل پر کون؟ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں گروپ کے طلبہ کی محنت، لگن اور تیاری، نیز ''مناظرانہ تیور'' قابل تحسین اور لائق دید تھے۔

وقت کی کمی کی وجہ سے اس دلچسپ، تعمیری اور اہم پروگرام میں شرکت

کے لئے نہ میں پورا وقت دے سکا، نہ ہی حکم کے فرائض انجام دے سکا۔ تاہم طلبہ کے اصرار پر آخر میں کچھ دیر ''آویزش حق وباطل'' کے عنوان پر اپنی کچھ گذارشات رکھیں ـــــ اگرچہ دارالعلوم کے احاطہ میں اور طلبۂ دارالعلوم کے سامنے لب کشائی بجائے خود مجھ جیسے ناتوانوں کے بس کی بات کہاں؟ یہ تو بڑے دل گردہ والوں کا کام ہے۔

طلبہ کی اس بامقصد واصلاحی مجلس سے رخصت ہونے کے بعد خواہرزادۂ عزیز مولانا ازہد مدنی سلّمہٗ نے اپنے والد ماجد مولانا سید ارشد مدنی صاحب کی ہدایت پر مجھے اپنی گاڑی سے دیوبند اسٹیشن پہنچا دیا اور وہاں سے نوچندی ایکسپریس سے روانہ ہوکر بعافیت تمام ۱۴؍اپریل کو علی الصباح لکھنؤ واپس آگیا۔

فالحمد للہ أولاً و آخراً۔

☆☆☆

ایک مبارک سفر

۲۰۱۰ء کا سفرِ حج میری اہلیہ کے جذبۂ صادق کا مرہون تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس کرم کا شکر ادا کرنے کی زبان وقلم میں طاقت نہیں کہ اس نے میری اپنی کسی صلاحیت واستحقاق کے بغیر اولاد کے معاملہ میں بہت خوش نصیب بنایا ہے ——— اسی سلسلہ کی ایک بات یہ ہے کہ میرے تیسرے نمبر کے فرزند اسامہ عبدالاحد ندوی سلّمہٗ ۲۰۰۸ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد جب فوراً ہی بسلسلۂ ملازمت دوحہ (قطر) گئے، اور حق تعالیٰ نے مالی طور پر انہیں کچھ مطمئن وآسودہ کیا تو ان کی سب سے پہلی خواہش اپنے والدین کو حج کرانے کی ہوئی۔ ۲۰۰۹ء کے حج کے موقع پر ہم لوگوں نے کچھ اپنے گھٹنے کے درد اور مالی استحکام اور پیر جمنے کے حوالے دے کر انہیں ٹال دیا۔ لیکن ان کا اصرار جاری رہنے کی وجہ سے ۲۰۱۰ء کے حج کے موقع پر ہم دونوں، اور ہماری معاونت کے لئے دوسرے نمبر کے بیٹے مفتی حارث عبدالرحیم قاسمی سلّمہٗ نے سرکاری حج کمیٹی کے ذریعہ سفرِ حج کی درخواست دے دی ——— اور میں خاص طور پر اپنے گھٹنوں کے درد کے حوالہ سے اپنے پروردگار سے یہ دعا کرتا رہا کہ اگر اپنے پیروں سے چل کر طواف وسعی اور پورا سفرِ حج کرنے کے لائق رہوں تو ہماری درخواست منظور کرائیے گا ——— ورنہ مجھے وہیل چیئر پر بیٹھ کر اور دوسروں پر بوجھ بن کر معذوروں والا حج گوارہ نہیں ہے۔ چنانچہ جب قرعہ اندازی ہوئی اور اس میں ہم لوگوں کا نام نہیں آیا تو میں نے یہ سوچ کر صبر کرلیا

کہ میری چاہت کے مطابق اللہ تعالیٰ کو میرا حج کرانا منظور نہیں ہے۔ اور اب اپنی دعا کی پابندی کرتے ہوئے اس کے خلاف مجھے اپنے رب سے درخواست کرنے کا بھی حق نہیں ہے؟۔ دل میں ایک کسک اور حاضری کی چاہت کے باوجود میں نے تو خاموشی اختیار کرلی، لیکن میری اہلیہ کی آتش شوق فروزاں ہوچکی تھی اور وہ بہت بے کلی محسوس کررہی تھیں۔ میرے تعلقات کے حوالے دے کر انہوں نے مجھ سے کئی مرتبہ طعنہ زنی کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ آپ چاہتے ہی نہیں ہیں۔ ورنہ کوشش کیجئے تو ان شاء اللہ کامیابی کی کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ مگر میں ہر مرتبہ اپنے پروردگار سے کی ہوئی دعا کا حوالہ دے کر انہیں خاموش ہونے پر مجبور کردیتا۔ اس دوران اسامہ سلّمہٗ فون کے ذریعہ برابر اصرار کرتے رہے کہ آپ لوگ ''پرائیوٹ ٹور'' کے ذریعہ جانے کا فیصلہ کرلیجئے، جس میں کسی قرعہ اندازی کا مسئلہ نہیں ہے۔ مگر مجھے اس بات کا بھی لحاظ تھا کہ ''پرائیوٹ ٹور'' کے ذریعہ سفر میں دوگنا سے زیادہ رقم خرچ ہوگی، اور میں ان کی سعادت مندی سے ''ناجائز فائدہ'' اٹھا کر ان کو مزید زیر بار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے یہی کہہ کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ دعا کرتے رہو۔ امسال نہ سہی تو ان شاء اللہ اگلے سال تمہارے ہی پیسے سے ہم لوگ حج کرلیں گے۔ اسامہ سلّمہٗ قریب قریب روزانہ ہی فون کرتے اور ان کی مجھ سے زیادہ اپنی ماں سے دیر دیر تک بات ہوتی، اور میں دیکھتا کہ اکثر بات کرتے ہوئے ان کی ماں کی آنکھیں بھیگ جایا کرتیں ——— اس درمیان ایک دن ان کی ماں کو فون پر میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ: تمہارے ابی چاہتے ہی نہیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ تو حج کرچکے ہیں، اس لئے ان کے دل میں وہ تڑپ نہیں ہے۔ اور میرا معاملہ یہ ہے کہ ابھی ہاتھ پیر چل رہے ہیں اور ماشاء اللہ تم لوگوں پر اتنی ذمہ داریاں نہیں ہیں ——— آگے کیا ہوگا، اور کیا حالات رہیں گے؟۔ اسے اللہ ہی جانتا ہے۔

اپنی ماں کی اس بات کا اسامہ سلّمہٗ پر اتنا اثر ہوا کہ پھر انہوں نے فون
کر کے مجھ سے اصرار کیا کہ آپ لوگ ہر قیمت پر ''پرائیوٹ ٹور'' کے ذریعہ چلے
جائیں۔ان شاء اللہ آسانی کے ساتھ مصارف کا انتظام ہو جائے گا۔اس کے
جواب میں جب میں نے پھران کی سعادت مندی کی تعریف کرتے ہوئے
دو گنے سے زائد مصارف کا حوالہ دے کر اگلے سال کی بات کہی تو انہوں نے
ایک ایسی بات کہہ دی جس نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا؟۔انہوں نے کہا تو
پھر ایسا ہے کہ امی کو لے کر حارث بھائی چلے جائیں،اللہ کو منظور ہے تو اگلے سال
میں خود آپ کو لے کر حج کے لئے چلوں گا۔

اسامہ سلّمہٗ کی اس پیش کش نے مجھے تشویش میں ڈال دیا۔اور میں نے
سوچا کہ میری اس روش سے تو میرا پتہ ہی کٹا جا رہا ہے؟۔میں نے اسامہ سلّمہٗ
سے کہا کہ مجھے دو تین دن کا موقع دو،اس کے بعد ان شاء اللہ جواب دوں گا۔

اور پھر میں نے صلوٰۃ الاستخارہ پڑھنے کے بعد اپنا فیصلہ تبدیل کرتے
ہوئے اللہ کا نام لے کر یو پی حج کمیٹی کے اس وقت کے سکریٹری صاحب سے
فون پر رابطہ قائم کر کے انہیں اپنی پوری آپ بیتی سنائی تو انہوں نے بہت خوش
دلی اور یقین کے ساتھ مجھ سے وعدہ کیا کہ ان شاء اللہ آپ لوگ اسی سال حج
کے لئے جائیں گے،جس کے لئے پوری تیاری کر لیجئے۔لیکن چوں کہ آپ نے
پہلے سے نہیں بتایا تھا،اس لئے اب میں آپ کو روانگی کی تاریخ بر وقت جہاز میں
جگہ کی فراہمی ہونے پر بتا سکوں گا۔ممکن ہے کہ آپ کو ۴۸ رگھنٹے کی بھی مہلت نہ
مل سکے۔اس لئے پوری طرح تیار رہئے اور حج کمیٹی کی ویب سائٹ کو دیکھتے
رہئے۔جیسے ہی آپ کا کور نمبر آئے ممکنہ عجلت کے ساتھ حج ہاؤس پہنچ کر رپورٹ
کر کے اپنے ٹکٹ و دیگر کاغذات حاصل کر لیجئے گا۔''بہتی گنگا دیکھ کر'' میں نے
اپنے ایک بہت قریبی نوجوان کا نام اور کور نمبر بھی انہیں لکھوا دیا۔یہ قریبی
نوجوان میرے مخلص کرم فرما اور میرے کالج میں بی-اے جماعت کے رفیق

درس حکیم محمد خالد یوسف صاحب مرحوم کے فرزند اور فہمینہ ہسپتال کے مالک
ڈاکٹر سلمان خالد کے چھوٹے بھائی سفیان خالد تھے۔ان کا نام شامل ہونے
سے مجھے یہ سہولت بھی میسر آ گئی کہ وہ لوگ برابر نیٹ پر دیکھتے رہے،جب کہ
میں ایک ''بے بہرہ'' قسم کا انسان جو کہ ''نیٹ اور اس کے آداب'' سے واقف نہ
تھا؟ چنانچہ ایک دن جب کہ میں مدرسہ میں تھا،لگ بھگ ۱۲ ربجے دن میں
عزیزی ڈاکٹر سلمان خالد کا فون آیا کہ ابھی جلد سے جلد حج کمیٹی جا کر اپنے
پاسپورٹ اور جہاز کے ٹکٹ حاصل کر لیں۔کیوں کہ پرسوں سہ پہر کی فلائٹ
سے آپ سب لوگوں کی روانگی کنفرم ہو گئی ہیں۔اس مسرت بخش خبر سے اپنی
اہلیہ کو فون سے مطلع کر کے میں اپنے مخلص و عزیز شاگرد مولانا محمد شفیع قاسمی استاذ
دار العلوم فاروقیہ کے ساتھ ان ہی کی بائیک سے مدرسہ سے سیدھے حج ہاؤس
پہنچ گیا۔اور دو تین گھنٹے کی ضروری کارروائی کے بعد ٹکٹ اور دوسرے کچھ
ضروری کاغذات لے کر بامراد،وشاداں وفرحاں گھر واپس آیا اور اپنے رب
کے حضور اس کے اس خصوصی انعام پر دوگانۂ شکر کا نذرانہ پیش کیا۔

عجلت اور ہڑبونگ کا یہ عالم تھا کہ ہمارے پاسپورٹ بھی دوسرے دن
یعنی اس مبارک سفر پر روانگی سے چند گھنٹے پہلے ہی مل سکے تھے۔اور پھر اس کے
دوسرے دن حسب پروگرام دوپہر کو اول وقت میں نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد ہم
لوگ اس مبارک سفر کے لئے اپنے گھر سے اللہ کے گھر کو پہنچنے کے ارادہ سے
نکلے،جسے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے خصوصی انعام واکرام کے بعد اپنی اہلیہ
کی طلب صادق کا مرہون قرار دیا ہے؟و ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

اس سفر حج کی درج بالا روداد کا ذکر تو تمہیدی طور پر صرف اس لئے کیا گیا
کہ ایک طرف اپنے رب کی بے حق واستحقاق نوازشوں کا اور دوسری طرف
''کسی'' کے جذبۂ صادق کی بارگاہ الٰہی میں پذیرائی کا کچھ بیان ہو سکے۔
سفرنامہ میں جس ''مبارک سفر'' کا ذکر ہے،اس کی کچھ مختصر روداد تو اب بیان کی

جارہی ہے:

——— ہوا یوں کہ حرمین شریفین کی اس حاضری نے اپنی تمام تر بداعمالیوں و نافرمانیوں کے باوجود گناہوں کی راکھ میں دبی ہوئی ''ایمان کی چنگاری'' کوفروزاں کردیا۔ میں نے اور مجھ سے بڑھ کر میری اہلیہ نے اپنی حیثیت وحوصلہ کے مطابق اپنے ارمان پورے کئے۔ میرے ساتھ میرے رب کا یہ خصوصی کرم بھی رہا کہ اس نے میری اپنے پیروں سے چل کر طواف وسعی کرنے کی چاہت بھی پوری کی۔ ۱۲/ذی الحجہ کو رمی جمرات کے بعد اپنی مکہ مکرمہ کی رہائش گاہ تک کا کم وبیش ۹-۱۰ کلومیٹر کا راستہ شدید بارش کی وجہ سے شرابور ہوتے ہوئے معجزاتی طور پر پیدل ہی طے کرا کے اپنی قدرت کاملہ کا برملا مظاہرہ فرمادیا——— ان اللّٰہ علیٰ کل شیء قدیر۔

اہلیہ اور فرزند سعید مفتی حارث سلّمہٗ کا تو یہ پہلا مقدس سفر حج تھا۔ حارث سلّمہٗ اپنی جوان العمری کی وجہ سے اور ان کی والدہ ماشاء اللہ جسمانی طور پر چست و درست ہونے کی وجہ سے ''مجھ معذور'' کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم سے خوب خوب اپنے ارمان پورے کرتے رہے۔ مکہ میں قیام کے دوران ان لوگوں نے مجھ سے کہیں زیادہ عمرے بھی کر لئے۔ حارث سلّمہٗ تو کئی مرتبہ اکیلے ہی بعد نماز فجر نکل گئے اور عمرہ کرنے کے بعد قیام گاہ واپس آئے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے اپنے والدین کی خدمت کرکے اس مقدس سفر کو اپنے لئے اور بھی نفع بخش بنالیا۔ والاجر علی اللّٰہ۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ ہم لوگوں کی لکھنؤ سے روانگی چوں کہ آخر کے جہازوں میں سے ایک سے ہوئی تھی اس لئے ہم لوگوں کو پہلے مکہ مکرمہ پہنچایا گیا تھا۔ اور حسب ضابطہ مکہ مکرمہ میں قیام اور حج کی ادائیگی کے بعد اس طرح ہم لوگوں کو وہاں سے مدینہ طیبہ کے لئے روانہ کیا گیا کہ ہم لوگ آسانی کے ساتھ وہاں کی چالیس نمازیں مسجد نبوی میں باجماعت ادا کرنے کے بعد وہیں سے

جدہ، اور پھر جدہ سے لکھنؤ واپس آجائیں۔

اب وہ مرحلہ آیا کہ کعبہ کی نگری مکہ مکرمہ اور پھر نو دن کے بعد شہر آرزو اور دیار نبی مدینہ منورہ کو دل پرغم اور چشم پرنم کے ساتھ چھوڑنا پڑا۔ دادا صاحبؒ کے تجربہ کی بنیاد پر پھر حاضری کی لو لگائے مکہ مکرمہ سے باب الوداع کے بجائے باب ابراہیم سے نکلنے کا اہتمام کیا گیا۔ اور جس سے جس طرح بن پڑا روتے دھوتے اور رب سے پھر واپسی کی التجائیں کرتا مکہ مکرمہ سے، اور پھر مسجد نبوی سے باب البقیع سے ''اک بار تو ہوجائے پھر نظر کرم اور'' کی صدا لگاتا واپسی کے لئے نکلا۔ اور پھر نگاہ حسرت ڈالتے بوجھل قدموں سے ہم سب مدینہ طیبہ سے جدہ، اور پھر جدہ ایئرپورٹ پر کچھ دیر ضروری خانہ پری کی کارروائیوں کے لئے رک کر اپنے وطن لکھنؤ واپس آگئے۔

واپسی کے بعد کئی ہفتہ تک خصوصاً اہلیہ کا تو یہ حال رہا جیسے وہ حرمین شریفین زیارت کے لئے عارضی طور پر نہ گئی ہوں، بلکہ لکھنؤ عارضی طور پر آئی ہوں اور پھر واپسی کی جلدی ہو؟۔ وقت گذرنے کے ساتھ یہ کیفیت تو نہیں رہی ——— دعا کے ساتھ ساتھ دو چیزیں ان کے معمولات میں شامل ہوگئیں۔ اول مجھ سے عمرہ کے لئے پھر حاضری دینے کا بار بار تقاضا، دوم اپنے پانچوں بیٹوں سے یہ ''فرمائشی حکم'' کہ کوئی بھی عمرہ یا حج کا ارادہ کرے تو مجھے ساتھ لے کر جانے ہی کی سوچے ——— چاہے اپنے اخراجات سفر مجھے خود ہی دینا پڑیں؟۔

ادھر سفر حج پر پانچ برس کی قانونی پابندی، اور پھر اخراجات کی کمی ہونے کی وجہ سے عمرہ میں سہولت ہونے کی وجہ سے مفتی حارث اور مولوی اسامہ سلمہما کے علاوہ میرے تینوں بیٹے عبدالمعبود، سالم اور معاویہ سلمہم کا اشتیاق دید بھی بڑھ چکا تھا اور یہ تینوں ہی ہر سال ''ٹور آپریٹروں'' کی طرف سے ''عمرہ پیکیج'' کا اخباری اعلان ہوتے ہی ہمک ہمک کر اپنے بے قرار جذبوں کا اظہار بھی کرتے اور اپنے والدین سے ''خصوصی دعا'' کی درخواست بھی کرتے۔ مسئلہ سب کے

ساتھ ظاہری اسباب میں کم وبیش یہی تھا کہ کئی برسوں تک مالی طور پر اخراجات سفر کے متحمل نہیں ہو سکے ——— اور پھر سب سے بڑھ کر بات وہی کہ گھر کے مالک کی طرف سے گھر کی زیارت کی اجازت کے بغیر اس کے گھر اوراس کے پیارے نبی کے در پر حاضری کیوں کر ہو سکتی تھی ؟۔

دوسری طرف بچوں کی ماں کچھ ''اپنی غرض'' سے اور کچھ ''فطری محبت'' کی وجہ سے اپنے بچوں اور اپنے شوہر کی مالی حالت مستحکم ہونے، اور زیارت حرمین کے لئے سفر کی دعائیں کرتی رہیں ——— بالآخر ۲۰۱۷ء میں وہ ساعت سعید آہی گئی کہ دعائیں رنگ لائیں، اور اذن حضوری ملتے ہی بے ساختہ کہنا پڑا کہ ؎

ترس آہی گیا ساقی کو آخر
مبارک مجھ کو میری تشنہ کامی

۲۴؍دسمبر ۲۰۱۷ء کو سہ پہر ۴۰-۵ کی فلائٹ سے ہم سات نفر کا قافلہ جس میں دونوں چھوٹے بیٹے سالم عبدالرحیم، معاویہ عبدالرحیم اوران کے والدین، نیز بھتیجے زید عبدالرحیم اور بچوں ہی کی طرح گودوں میں کھیلا کودا سالم سلّمہٗ کا نوجوان دوست نورالہدیٰ اوراس کی نوبیاہتا اہلیہ شامل تھے۔ ''نگرامی ٹور اینڈ ٹریول'' کی وساطت سے لکھنؤ سے جدہ کے لئے روانہ ہو کر ۵؍گھنٹہ کی مسافت طے کر کے نصف شب کے قریب جدہ ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ ہمارے اس عمرہ پیکیج کی کل مدت سفر سترہ (۱۷) یوم تھی۔ جس میں پہلے مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کرنا، اور پھر آخر کے چھ دنوں میں مدینہ طیبہ قیام کر کے وہیں سے براہ جدہ واپسی کا نظام تھا۔ روانگی اور واپسی کے دونوں سفر کے دن بھی ان سترہ دنوں ہی میں شامل تھے ——— یعنی لکھنؤ سے ۲۴؍دسمبر ۲۰۱۷ء کو روانہ ہو کر ۹؍جنوری ۲۰۱۸ء کو لکھنؤ واپس آجانا تھا۔

جدہ ایئرپورٹ پر ہمارے استقبال کے لئے دو نوجوان موجود تھے، جو

ہمیں ایئرپورٹ سے باہر نکلنے کے بعد اسی وقت لگژری بس کے ذریعہ مکہ مکرمہ لے گئے اور ہمیں ایک عالی شان ہوٹل لینڈ پریمیم (Land Premium) میں اتارا۔ جہاں ہمارا اگلے نو دنوں تک پوری سہولتوں و آسائشوں کے ساتھ قیام رہا۔ چوں کہ ہم نے احرام لکھنؤ ایئرپورٹ ہی پر باندھ لیا تھا اور ہم احرام کی پابندیوں میں تھے۔ اس لئے ہماری خواہش اولین وقت ہی عمرہ کر کے احرام کی پابندیوں سے آزادی حاصل کر لینے کی تھی۔ لیکن جدہ ایئرپورٹ پر ضروری سفری کارروائیوں، پھر وہاں سے مکہ مکرمہ میں اپنے ہوٹل تک پہنچنے، اور رات کے کھانے سے فارغ ہونے میں اتنا وقت لگ گیا تھا کہ وہاں کے وقت کے لحاظ سے بھی نصف سے کچھ زائد ہی شب گذر چکی تھی۔ اس لئے ہمیں جدہ سے اپنے ساتھ لائے دونوں نوجوان محمد عثمان اور محمد شعیب نے یہ مخلصانہ مشورہ دیا کہ آپ لوگ سفر کی تکان اور نیند کے غلبہ کی وجہ سے اس وقت عمرہ کرنے میں اور بھی تھک جائیں گے۔ اور شدید تکان کی وجہ سے بیمار ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ کیوں کہ عمرہ کے دونوں رکن طواف اور سعی میں بھی مسلسل چلنا ہی پڑتا ہے، جس کے لئے پہلے سے جسمانی طور پر چست و درست ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہو کہ اس وقت رات کے بقیہ چند گھنٹے آپ لوگ آرام کر لیں۔ پھر صبح بعد نماز فجر متصلاً ہم (یعنی ہمارے رہبر محمد شعیب) آپ لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر ان شاء اللہ اطمینان سے عمرہ کرائیں گے۔

یہ مشورہ چوں کہ بہت معقول تھا جو ہماری ہی راحت وصحت کا لحاظ رکھتے ہوئے دیا گیا تھا، اس لئے ہم نے اسے بہ طیب خاطر قبول کیا، اور اپنے ہوٹل کے کمروں میں پہنچ کر اس طرح ''گھوڑے بیچ کر'' سوئے کہ نماز فجر کے لئے جگائے جانے پر ہی ہم بیدار ہوئے۔

آگے کی روداد سفر بیان کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ پہلے اپنے ان میزبانوں کے بارے میں مختصر طور پر کچھ بیان کر دیا جائے جنہوں نے جدہ

ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد سے واپسی پر جدہ ہی میں ہمارے بورڈنگ پاس حاصل کر لینے تک نہ صرف ہماری رہنمائی کی، بلکہ ہمیں ہر طرح کی سہولت وراحت عطا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہمارے لئے لکھنوی ذوق کے مطابق کھانے، ناشتے کا نظم کیا، عمرہ وطواف، اور مسجد نبوی کی حاضری سے لے کر مقامات مقدسہ کی زیارات، حتیٰ کہ ہمارے کپڑوں کی دھلائی تک کا بہترین اور باسلیقہ انتظام کر کے ہمیں ہر فکر سے آزار رکھتے ہوئے حسب توفیق ہمیں صرف عبادت کے لئے فارغ کئے رکھا۔ ان میں بھی محمد شعیب نامی جوان کے ''جذبۂ خدمت'' کا تو جواب نہیں، نہ صرف اپنے جذبۂ خدمت اور ان تھک محنت سے، بلکہ اپنے اخلاق اور نشاط افروز باتوں سے بھی ہماری دل بستگی کا سامان کر کے خوب خوب دعائیں حاصل کیں۔ فجزاهم الله احسن الجزاء۔

یوں تو ان کی میزبانی اور کھانے پینے ور ہائش کے نظم کے ساتھ ہی دیگر سہولیات کی فراہمی تجارتی و پیشہ ورانہ نوعیت کی تھی —— کیوں کہ ان سے ہمیں لکھنؤ سے بھیجنے والی ٹریولنگ ایجنسی ''نگرامی ٹور اینڈ ٹریلوس'' کے تجارتی معاملات تھے کہ وہ اپنے جن لوگوں کو انڈیا سے بھیجیں گے انہیں سعودیہ میں قیام کے دوران تمام سہولیات کی فراہمی کی ذمہ داری ان لوگوں کی ہوگی —— یہ وہ تجارتی معاملہ تھا جس کی ہمیں پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی۔ اور ہم یہی سمجھ کر آئے تھے کہ مکہ ومدینہ میں بھی ہماری ٹریولنگ ایجنسی کے افراد ہی ہمارے میزبان ہوں گے؟؟ لیکن اپنے سعودیہ کے اصل میزبانوں سے گھل مل کر صحیح صورت حال کا نہ صرف علم ہوا، بلکہ اپنے ان مخلص میزبانوں سے تعارف حاصل کر کے ہی بے حد مسرت واپنائیت کا احساس پیدا ہو گیا تھا —— ان کی خدمت سے منافع حاصل کرنے کی نوبت تو بعد میں آئی؟

دراصل ہمارے سرزمین حرمین کے اصل میزبان عزیزم عثمان برادران میرے بہت قدیم کرم فرما، اور ہمارے خاندانی بزرگوں کی نسبت سے

گھر گھرانے کے ایک فرد ہونے کے ناطے مولانا محمد رضوان قاسمی بہرائچی کے فرزندان ہیں۔ مولانا قاسمی (ابھی حالیہ سلسلہ اموات کی ایک کڑی بن کر وہ بھی ہماری اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے، جب کہ ۲۰۱۷ء میں وہ حیات ہوتے ہوئے بھی ضعف وعلالت کے باعث اس لائق نہ تھے کہ میری چاہت کے باوجود ان سے ملاقات ہو پاتی۔ حق تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کاملہ فرمائے) پچاس برس سے زائد مدت سے مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے اس طرح ''مکی'' ہو گئے تھے کہ عثمان اور غالباً ان کے کئی بھائی بہنوں کی ولادت بھی وہیں ہوئی۔ اور معلوم یہ بھی ہوا تھا کہ عثمان کی تو سسرال بھی مدینہ طیبہ ہی کی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں تعلیمی سال ۸۷-۱۳۸۶ھ مطابق ۶۷-۱۹۶۶ء میں جامعہ مسعودیہ نور العلوم بہرائچ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اکثر مدرسہ کے ناظم تعلیمات اور بھائی رضوان صاحب مرحوم کے والد ماجد مولانا حافظ محمد نعمان صاحب مرحوم مجھے بلوا کر اپنے فرزند مذکور کو بھیجنے والے خطوط پر انگریزی میں پتہ لکھواتے تھے (غالباً اس وقت میں ہی مدرسہ کا ایک اکیلا طالب عالم تھا جو انگریزی زبان کی کچھ شدھ بدھ رکھنے کی وجہ سے انگریزی میں پتہ لکھ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا) یعنی ۱۹۶۶ء کے اواخر میں جب نور العلوم پہنچا تو بھائی رضوان صاحب مکہ مکرمہ بسلسلہ ملازمت جا چکے تھے۔ پھر وہاں رہتے ہوئے ان کا اپنا کاروبار بھی ہو گیا تھا جسے ان کے لائق فرزندوں نے نئی جہتیں دیتے ہوئے کافی بڑھا لیا تھا۔

اس طرح مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ میرے میزبان عثمان میاں میرے بھتیجے نکلے۔ اور جب اس رشتہ کا ان کو علم ہوا تو انہوں نے از خود بھی اور اپنے والد ماجد کی ہدایات کا لحاظ رکھ کر بھی ہم لوگوں کی راحت رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ جب کہ ان کے دست راست اور ہمارے عمرہ کے رہبر اور ہوٹل میں ہر وقت کے رفیق ونگراں عزیزی محمد شعیب لکھنؤ میں ہمارے محلہ

پاٹا نالہ سے بالکل قریبی محلّہ بلوچ پورہ کے باشندہ اور ہمارے اہل تعلق خانوادہ کے ایک فرد تھے۔ جو کہ عثمان کے یہاں ایک ملازم نہیں، ایک معاون کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اور اپنے حسن اخلاق و ظریفانہ طبیعت کے ذریعہ اپنے مہمانوں کے دلوں کو جیت کر ان کی دعائیں حاصل کرنے کا ہنر رکھتے تھے۔

اس طرح بالکل غیر متوقع طور پر محض اللہ کے کرم سے ہم لوگوں کو حالت سفر میں گھر جیسا بلکہ گھر سے بڑھ کر آرام وسکون ملتا رہا۔ و ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

ہمارے مکہ مکرمہ پہنچ کر رات میں وہاں آرام کرنے کے بعد حسب وعدہ صبح بعد نماز فجر شعیب میاں ہمارے کمرہ آگئے اور ہمیں بے حد لذیذ و پر تکلّف ناشتہ کرانے کے بعد اپنے ساتھ ہوٹل کی بس سے حرم شریف کی طرف عمرہ کرانے کے لئے چل دیئے۔ ہمارا یہ ہوٹل مکہ مکرمہ کے محلّہ ''تیسیر'' میں حرم شریف سے ۴-۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع تھا، اور یہ فاصلہ چند منٹ میں طے ہوگیا۔ بس حرم شریف کے بالکل قریب اپنے مقررہ مقام پر رکی۔ یہاں سے مطاف تک ہمیں پیدل ہی چل کر جانا تھا۔ اور یہ فاصلہ بھی ماشاء اللہ مسجد حرام کی روز افزوں وسعتوں کی وجہ سے اس وقت بھی ایک کلومیٹر سے کم نہ تھا، جو میرے دیگر ساتھیوں اور بس میں سوار ہو کر آنے والے دیگر افراد کے لئے تو ''شوق دید کعبہ'' اور صحن حرام ہونے کی وجہ سے بہت معمولی تھا، اور انہوں نے اپنی عام رفتار سے بڑھ کر تیزی کے ساتھ یہ فاصلہ طے کرنا شروع کردیا —— لیکن میرے لئے گھٹنوں کے شدید درد کی وجہ سے چند قدم کے بعد چلنا دشوار ہوگیا، اور مجھے بیٹھ کر کچھ دیر آرام کرنا پڑا۔ چوں کہ اس وقت ''وہیل چیئر'' جیسی کوئی سہولت بھی میسر نہ تھی، اس لئے پیدل ہی چل کر طواف اور پھر سعی کے لئے تو جانا ہی تھا —— میرے ساتھ اس وقت میرے اپنے رفیق سفر چار نوجوان تھے اور پانچویں شعیب میاں بن گئے تھے، جنہوں نے سہارا دیتے اور بٹھاتے اٹھاتے

کسی طرح مطاف تک پہنچایا، جہاں پہنچ کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد شعیب کی رہنمائی میں ہم نے طواف کے لئے کعبہ مکرمہ کے گرداگرد چکر لگانا شروع کیا۔ کیوں کر بیان ہو رب کعبہ کے اس انعام خصوصی کا کہ جو شخص بس اسٹینڈ سے مطاف تک پہنچنے میں کئی جگہ رک رک کر بیٹھنے کے باوجود پسینے پسینے ہوگیا تھا۔ اسے ہزاروں لوگوں کی بھیڑ میں طواف کے سات شوط، اور اس کے بعد سعی کرتے ہوئے صفا و مروہ کے سات چکر لگانے میں کوئی خاص زحمت نہیں ہوئی۔ اور وہاں ''وہیل چیئر'' کی سہولت فراہم ہونے کے باوجود بفضلہٖ تعالیٰ میں نے پورا طواف وسعی پیدل چل کر ادا کیا۔ فلله الحمد و الشكر۔

عمرہ سے فراغت کے بعد بالوں کا حلق اور حرم کی پہلی نماز باجماعت ظہر ادا کرنے کے بعد ہم لوگ اپنے مخلص رہبر شعیب کے ساتھ اپنے ہوٹل واپس آگئے۔

دوسرے دن سے اپنے تجربہ کار رہبر کے مشورہ سے حرم کی حاضری اور نماز باجماعت ادائیگی کے لئے ہم لوگوں نے نظام یہ بنایا کہ ہم تہجد کی نماز کے وقت حرم شریف پہنچ جاتے، پھر فجر اور اشراق کی نمازوں کی ادائیگی کے بعد اپنے ہوٹل واپس آکر ناشتہ کرکے آرام کرتے۔ ظہر کی نماز ہوٹل ہی کی شاندار مسجد میں یا پھر قریب کی ''مسجد طیبی'' میں ادا کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا کھاتے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد نماز عصر سے کافی پہلے حرم شریف پہنچ جاتے، اور وہاں سے عصر، مغرب، اور عشاء کی نمازوں کی ادائیگی کے بعد ہوٹل واپس آکر رات کا کھانا کھاتے اور کچھ دیر بات چیت میں گذار کر رات کی پرسکون نیند میں غرق ہوجاتے —— قیام مکہ کے دوران ہمارا روزانہ کا یہی نظام رہا۔ جس میں بفضلہٖ تعالیٰ حرم کی حاضری، وہاں کے طواف، اور حسب توفیق مزید عمروں کی ادائیگی کی توفیق بھی ملتی رہی۔ اور ضرورت کے مطابق جسمانی آرام کے ساتھ ساتھ ملاقات کے لئے آنے والے احباب سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں

——ایسے احباب میں خصوصیت کے ساتھ ہمارے لکھنؤ کے الحاج عزیز احمد کا نام قابل ذکر ہے، جو اکثر ہم لوگوں کے لئے پھل فروٹ و دیگر اشیائے خوردنی بھی لے کر آتے۔ عزیز احمد کا گزشتہ چالیس برس سے زائد عرصہ سے مکہ مکرمہ میں قیام تھا اور انہیں وہاں کا ''اقامہ'' حاصل تھا۔ اس لئے انہیں مکہ کے گلی کوچوں، اور چپہ چپہ کی اسی طرح واقفیت تھی جس طرح وہاں کے کسی مقامی باشندہ کو ہوسکتی تھی۔ اور اس واقفیت و تجربات کا ۲۰۱۰ء کے حج کے موقع پر ہم لوگوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا تھا —— سب سے عمدہ اور مفید بات یہ ہوئی تھی کہ حج سے دو چار دن پہلے وہ اپنی کار سے لے کر ہم لوگوں کو حج کے مقامات مقدسہ جیسے میدان عرفات، مسجد نمرہ، منیٰ اور اس کے خیمے، مسجد خیف، جمرات ثلاثہ، نیز عرفات سے منیٰ کی سرحد اور وہاں ایک طرف سے ''بداية منىٰ'' اور دوسری طرف ''نهاية منىٰ'' کا لگا ہوا سرکاری بورڈ اور پھر ''مشعر حرام'' جیسے نہایت ہی اہم مقامات کی زیارت کرا لائے تھے۔ اور ان مقامات کی مساجد میں دوگانۂ نفل ادا کرنے کی سعادت بھی ان کی کرم فرمائی سے حاصل ہوگئی تھی۔ پھر ''مشعر حرام'' اور ''مزدلفہ'' کی ضروری واقفیت سے ہمیں ایسی سعادت حاصل ہوئی جس کا صحیح اندازہ اہل علم ہی کر سکتے ہیں —— کیوں کہ عرفات سے واپسی پر مزدلفہ ہی میں قیام ضروری ہے —— جب کہ عام طور پر خیمے منیٰ کی حدود کے اندر ہی اور مزدلفہ کی حد سے پہلے ہی سے لگے دکھائی دینے لگتے ہیں اور اس سلسلہ میں کسی سرکاری رہنمائی کا نظم نہ ہونے کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں حجاج کرام دسویں ذی الحجہ کی شب کا واجب قیام ناواقفیت کی بنا پر مزدلفہ کے بجائے منیٰ ہی میں کر لیتے ہیں —— اور ایسا ان کی ناواقفیت ومعذوری کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ رحیم و کریم کی ذات سے پوری امید ہے کہ ان شاء اللہ ایسے تمام لوگوں کے حج کو وہ ضرور قبول فرمالیں گے۔ اسی موقع پر مجھے اپنے عزیز بھتیجے حاجی عزیز احمد (میرے بچپن کے بہت ہی مخلص

دوست الحاج رفیق احمد کے حقیقی بھتیجے ہونے کی وجہ سے ان کا پورا گھرانہ بچپن ہی سے میرے لئے اپنے حقیقی رشتہ داروں جیسا رہا ہے۔ اور اسی نسبت سے حاجی عزیز احمد بھی اپنی کم عمری ہی سے میرے لئے مثل بھتیجہ کے سعادت مند رہے ہیں۔ وہ ان کے والد حاجی وحید احمد مرحوم اور چچا حاجی نذیر احمد مرحوم ۱۹۷۷ء میں میرے پہلے سفر حج کے موقع پر بھی مکہ مکرمہ ہی میں تھے اور ان لوگوں نے اس وقت بھی میرے لئے بڑی راحت کا سامان کیا تھا۔ ''جزاهم الله احسن الجزاء'') کے توسط سے یہ سعادت بھی حاصل ہوئی تھی کہ مجھے حرم مکی کے بالمقابل اس لائبریری کے اندر جانے، وہاں کی کتابوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے، اور ذمہ داروں سے کچھ گفتگو کا موقع بھی ملا۔ کیوں کہ ان دنوں لائبریری میں کچھ تعمیری کاموں کا ٹھیکہ حاصل ہونے کی وجہ سے حاجی عزیز احمد کی اندر تک رسائی تھی، جس کا فائدہ انہوں نے اپنے حسن اخلاق اور سعادت مندی کی وجہ سے مجھے بھی پہنچایا۔ ورنہ ایام حج میں وہاں کے ملازمین کے سوا کسی باہری شخص کو داخلہ کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔

مشہور یہ ہے کہ یہ لائبریری مولد النبی یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت میں واقع ہے۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے اس شناخت کو چھپایا جاتا ہے اور پوچھنے پر متعلقہ ذمہ داران اس کی تردید بھی کرتے ہیں۔

برادرم محمد شعیب صاحب کی رہنمائی میں مکہ پہنچنے کے بعد پہلے عمرہ کے موقع پر بس اسٹینڈ سے حرم کے مطاف تک پہنچنے میں گھٹنوں کے درد کی وجہ سے مجھے اور میری وجہ سے دوسروں کو جس تکلیف سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس کے پیش نظر شعیب کے مشورہ پر ہم لوگوں نے اسی وقت یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میرے لئے ایک وہیل چیئر خرید لی جائے، تا کہ کم از کم مطاف تک پہنچنے میں تو کوئی دشواری نہ ہو۔ چنانچہ واپسی پر اپنے ہوٹل کے قریب واقع دوکان سے ایک پرانی اور اچھی حالت کی وہیل چیئر خرید لی گئی، جسے چلانے کے لئے ماشاء اللہ میرے

ساتھ چار چار نو جوان لڑکے تھے ہی۔ خدا کے فضل وکرم سے اس وہیل چیئر کی
وجہ سے مکہ مکرمہ میں، اور پھر اس کے بعد مدینہ طیبہ میں میرے لئے بڑی
آسانیاں ہوئیں۔ اگرچہ بفضلہٖ تعالیٰ طواف اپنے پیروں سے چل کر ہی کرنے
کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ البتہ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کے روانگی سے قبل کا
آخری طواف حرم شریف کی تیسری منزل سے وہاں موجود ''الیکٹرانک وہیل
چیئر'' کے ذریعہ اپنے ''رفیق عمرہ'' جناب علی وارث صاحب کے ساتھ کیا تھا۔
جو پیدائشی طور پر مجھ سے کہیں زیادہ پیروں سے معذور ہونے کی وجہ سے اسی
''وہیل چیئر'' سے برابر طواف کرتے رہے تھے (دیویٰ ضلع بارہ بنکی کے ایک
مدرسہ کے استاذ جناب علی وارث صاحب نہایت ہی زندہ دل اور مرنجان مرنج
آدمی ہیں۔ انہیں پہلی مرتبہ عمرہ کے لئے روانہ ہوتے وقت لکھنؤ ایئرپورٹ پر
دیکھ کر بہت ترس آیا تھا کہ یہ بے چارے جو دو قدم بھی اپنے پیروں سے چلنے
کے قابل نہیں ہیں، کس طرح عمرہ کریں گے؟۔ پھر ان کی اس ''ہمت مردانہ''
نے مجھے حوصلہ بھی دیا تھا کہ جب اس معذوری کے باوجود یہ عمرہ کرسکتے ہیں تو
بفضلہٖ تعالیٰ ان سے کہیں اچھے حال میں ہوتے ہوئے میں کیوں نہیں کرسکتا؟)
چونکہ علی وارث صاحب کا یہ سفر عمرہ بھی میری ہی والی ٹریولنگ ایجنسی کی معرفت
ہوا تھا۔ اس لئے ان کا قیام بھی اسی ہوٹل میں مکہ اور مدینہ دونوں مقامات پر ہوا
جہاں ہم لوگ مقیم ہوئے۔ اس لئے ہر کھانے ناشتے اور بسا اوقات حرمین کی
حاضری کے مواقع پر ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جب ان سے کھل کر اور بے
تکلّفانہ انداز میں بات چیت ہوئی تو یہ علم ہوکر بہت مسرت ہوئی کہ وہ ہمارے
کاکوری کے ایک معزز خانوادہ کے داماد ہیں۔ اور وہ مجھ سے پہلے ہی سے واقف
ہیں —— عمرہ کے اس مبارک سفر کی حصول یابیوں میں سے ایک علی وارث
صاحب کو بھی قرار دیتا ہوں۔ کیوں کہ موصوف نے اپنے شاعرانہ مزاج اور خوش
اخلاقی کی ذریعہ چند دنوں کی ان ملاقاتوں ہی کے ذریعہ میرے دل میں اپنے

لئے جگہ بنالی تھی اور واٹس ایپ کے ذریعہ آج تک ان سے کسی نہ کسی درجہ
کا رابطہ قائم ہے)۔

مدینہ طیبہ پہنچ کر تو میری یہ ''وہیل چیئر'' نہ صرف میرے لئے بلکہ میرے
ساتھ کے نوجوان بچوں کے لئے بھی ''نعمت عظمیٰ'' ثابت ہوئی۔ اور اس پر بیٹھ کر
میں ''ایک معذور'' نہیں، بلکہ ''ایک تخت نشین'' سلطان جیسا بن جایا کرتا تھا،
جس کے اردو گرد میرے ساتھ کے یہ چاروں بچے پروانہ وار اس لئے منڈلایا
کرتے تھے کہ ان میں سے ہر ایک کی یہ طلب ہوتی کہ میں اس سے اپنی کرسی
ڈھکیلنے کے لئے کہوں۔ بالآخر سب کی یکساں طلب پا کر ہر نماز کے وقت کے
لئے مجھے ان کی الگ الگ باریاں مقرر کرنا پڑیں؟ —— اور اپنے رب کے
فرمان عسیٰ أن تکرھوا شیئاً و ھو خیرلکم کی صداقت کا بہ چشم خود مشاہدہ
ہوا۔ و ذالك فضل الله یؤتیه من یشاء۔

بات دراصل یوں تھی کہ روضۃ النبی پر حاضری دے کر صلوٰۃ وسلام کا
نذرانہ پیش کرنے، اور روضہ الجنۃ میں دوگانہ نماز کی ادائیگی کے لئے معذورین
(یعنی ''وہیل چیئر'' نشینوں) کے لئے انتظامیہ کی طرف سے ان کی معذوری کی
رعایت کرتے ہوئے داخلہ کا خصوصی نظم تھا۔ ہر نماز کے بعد روضۃ الجنۃ میں
دوگانہ نفل ادا کرنے کے بعد صلوٰۃ وسلام پیش کرنے والوں کا ایک ہجوم ہوتا
جس کے لئے پولیس اہل کاروں کی طرف سے ایک خصوصی رکاوٹی پردہ کا نظم
ہوتا، اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اس پردہ کو ہٹا کر وہ مناسب تعداد میں لوگوں کو
اندر آنے کی اجازت دیتے رہتے۔ حاضری دینے والوں کے ہجوم کی وجہ سے
اکثر کافی کافی دیر تک اپنی باری آنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً ضعیف العمر
اور کمزور لوگ تو بہت بہت دیر انتظار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور عام طور پر
لوگ کسی ایک یا دو نمازوں کے بعد ہی ایک دن میں حاضری دے پاتے ہیں۔
جب کہ ''معذور کرسی نشینوں'' کا یہ خصوصی نظم رکھا گیا تھا کہ ان کو مع اپنی ''کرسی''

اور ''کرسی ڈرائیوروں'' کے بڑے اکرام کے ساتھ ''ریاض الجنۃ'' کے ایک دروازہ کے سامنے پہنچا دیا جاتا، اور جب وہ دس بیس کی تعداد میں ہوجاتے تو بقیہ لوگوں کو آنے سے روک کر انہیں ''اپنے کرسی ڈرائیوروں'' کے ساتھ داخلہ کی اجازت دی جاتی۔ اور پھر اندر بھی منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی داہنے طرف ان کے لئے مخصوص جگہ پہنچا دیا جاتا، تاکہ وہ روضۃ الجنۃ میں نماز دوگانہ ادا کرسکیں۔ انہیں بہ نسبت دوسروں کے وقت بھی اتنا دیا جاتا کہ عام طور پر یہ معذورین دو کے بجائے چار رکعت نماز آسانی کے ساتھ پڑھ لیتے۔

اللہ تعالیٰ کے اپنے گنہگار بندوں پر بھی رحمتوں کی بارش اور نوازنے کے انداز دیکھئے کہ میری گھٹنوں کے درد کی معذوری کو نہ صرف میرے لئے بلکہ میرے ساتھ والوں کے لئے ایک ناقابل تصور انعام کا وسیلہ بنا دیا—— پھر ہوا یہ کہ میں اپنی معذورین والی کرسی پر بیٹھ جاتا اور ہر نماز کے بعد باری باری میرے ہم راہی چاروں بچوں میں سے کوئی ایک میری کرسی پکڑے روضۃ الجنۃ کے اندر چند منٹوں کے توقف کے بعد پہنچ کر دو-چار، جیسا موقع ہوتا، نفل کی نماز پڑھ کر اور روضۂ اقدس پر حاضری دے کر صلوۃ وسلام کا نذرانہ پیش کر دیتے۔ جتنے دن مدینہ طیبہ میں قیام رہا، یہی معمول رہا کہ پانچوں وقت کی نمازوں کے بعد اسی طرح حاضری ہوتی رہی —— یہ خصوصی نعمت مجھے اس عمرہ میں ایسی ملی کہ نہ اس سے پہلے مجھے ملی تھی، نہ ہی اکثر صحت مند و توانا لوگوں کو مل پاتی ہے—— مالک تیرے کرم کے انداز نرالے؟؟

مکہ مکرمہ ہی کی طرح مدینہ طیبہ میں بھی ہم لوگوں کا قیام ایک ہوٹل میں رہا، اور کھانے و ناشتے کے لئے برادرم محمد شعیب اپنے ہم راہ اپنے باورچی حنیف بھائی کو لے کر آئے تھے، جنہوں نے مکہ ہی کی طرح مدینہ میں بھی دونوں وقت کے کھانے اور پرلطف وحسب دل خواہ ناشتہ کا انتظام کیا۔

چوں کہ مدینہ طیبہ میں کوئی مخصوص عبادت نہیں ہوتی، بس مسجد نبوی میں

نماز پنج گانہ ہی وہاں کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ جس کا اجر وثواب احادیث مبارکہ میں عام مساجد کے مقابلہ میں پچاس ہزار گنا زیادہ بتایا گیا ہے ——اس لئے مدینہ میں بس اسی کا اہتمام کیا گیا کہ چند روزہ قیام کے دوران پانچوں وقت کی نماز باجماعت مسجد نبوی ہی میں ادا کی جائے۔ مدینہ طیبہ میں میرے ایک چھوٹے بھائی مولوی عبدالولی فاروقی کے چھوٹے فرزند عزیزی ڈاکٹر طاہر عبدالرحیم سلّمۂ اپنی اہلیہ اور میرے دوسرے چھوٹے بھائی حافظ عبدالکریم کی بیٹی کے ساتھ بسلسلہ ملازمت قیام پذیر ہیں، جہاں وہ ایک سرکاری ہسپتال میں ملازمت کرتے ہیں۔ میرے یہ بھتیجی بھتیجے اپنے فرزند عمر سلّمۂ کے ساتھ میرے ہوٹل کی قیام گاہ پر ملنے کے لئے آئے۔ اور ان دونوں کا اصرار رہا کہ ہم لوگ ان کے گھر ہی میں قیام کریں۔ مگر ہم لوگوں نے باوجود تمام سہولیات میسر ہونے کے ان کے یہاں نہ جا کر اپنے ہوٹل ہی میں رہنا اس لئے پسند کیا کہ ان کا مکان مسجد نبوی سے کئی کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا، اور وہاں سے پانچوں وقت مسجد نبوی میں نماز کے لئے حاضری نہ ہو پاتی —— البتہ ایک دن بعد نماز عشاء رات کا کھانا ہم سب لوگوں نے ان کے مکان پر پہنچ کر ہی کھایا۔ ہمیں لے جانے اور واپس ہوٹل پہنچانے کی ذمہ داری طاہر سلّمۂ نے انجام دی۔ جس کے لئے ان کو دو مرتبہ اپنی گاڑی لے کر آنا جانا پڑا۔

مدینہ طیبہ میں ان کے علاوہ بھی کچھ اقرباء واحباب قیام پذیر ہیں۔ جن میں اس وقت تک وہاں مقیم میرے سعادت مند شاگرد محمد غالب سلّمۂ بھی شامل تھے۔ جنہوں نے ایک عمرہ کے موقع پر ہم لوگوں کے دو روزہ قیام کے لئے مدینہ طیبہ میں کرایہ پر کمرہ کا بھی انتظام کیا تھا، اور اس موقع پر انہوں نے ہم لوگوں کی ہر طرح خدمت کر کے خوب خوب دعائیں بھی لی تھیں —— مگر اس موقع پر طاہر سلّمۂ کے علاوہ ہم نے کسی کو بھی اپنے مدینہ کی حاضری کی اس لئے قصداً اطلاع نہیں دی تھی کہ بات چیت، دعوت ومدارات وغیرہ میں جو وقت لگتا وہ

مسجد نبوی ہی میں گذارا جائے کہ اللہ جانے پھر اس دیار مقدس میں حاضری ہو کہ نہ ہو؟ ——— اور ہوا بھی کچھ یہی کہ اس حاضری کو کئی برس کا عرصہ گذر چکا مگر اب تک باوجود اپنی اور اس سے بڑھ کر اہلیہ کی طلب وتڑپ کے پھر حاضری نہیں ہوسکی ہے۔ دعا اور طلب تو یہی ہے کہ پھر ایک مرتبہ ہی سہی، دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری ہوجاتی ——— مگر ہوگا وہی جو احکم الحاکمین کا فیصلہ ہوگا۔

۲۴/دسمبر ۲۰۱۷ء کو لکھنؤ سے شروع ہونے والے اس مبارک سفر کا اختتام ۹/جنوری ۲۰۱۸ء کو ہوا۔ جب ہم مدینہ طیبہ سے جدہ، اور پھر جدہ سے جہاز کے ذریعہ شام کو نماز مغرب سے کچھ قبل بعافیت تمام لکھنؤ واپس پہنچے۔ واپسی میں بھی جدہ ایئرپورٹ پر ہر قسم کی سفری سہولیات فراہم کرانے کے لئے عزیزان محمد عثمان ومحمد شعیب آخر تک موجود رہے۔ اس طرح انہوں نے مہمان نوازی کے ساتھ ہی اپنے دیرینہ خاندانی روابط ورشتوں کا پورا پورا حق ادا کردیا۔

فجزاهما الله أحسن الجزاء۔

سفر اندر سفر

۲۵/فروری ۲۰۲۱ء کو بوڈینہ خرد ضلع مظفرنگر کے لئے نوچندی ایکسپریس سے اہلیہ، بڑے بیٹے قاری عبدالمعبود فاروقی اور ان کی اہلیہ، نیز چھوٹی بیٹی وداماد کی ہمراہی میں کیا جانے والا یہ سفر یوں تو خالص نجی نوعیت کا، چھوٹی بیٹی کی سسرال کی ایک تقریب شادی میں شرکت کے لئے تھا۔ لیکن کئی برس کے وقفہ کے بعد ریل کے ذریعہ کیا جانے والا یہ سفر چوں کہ عام معمول کے خلاف کئی دن قیام کے ارادہ سے تھا، اور دیوبند سے قربت کی وجہ سے کچھ دیر کے لئے مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں حاضری دینا بھی پہلے سے طے تھا ——— پھر اس سے ہٹ کر متعدد دیگر قریبی مقامات کی حاضری، بہت سی علمی دینی اور سماجی اہمیت کی حامل شخصیات سے ملاقاتوں کے ساتھ ہی کچھ ہلکے پھلکے تجربات نے اس سفر کو بہت دلچسپ اور اس لائق بنادیا کہ اس کی روداد کو ضبط تحریر میں لانا مناسب سمجھا۔

سفر اور اس کی سرگذشت سے پہلے ''جملہ معترضہ'' کے طور پر لفظ ''خرد'' کے تعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ ''غلط العوام'' نہیں بلکہ ''عمومی غلطی'' بوڈینہ میں بھی جابجا اس کی صفت ''خرد'' کے سلسلہ میں لکھی ہوئی نظر آئی کہ اس کا صحیح املا واؤ کے بغیر ''خرد'' کے بجائے غلط املا ''خورد'' ہی لکھا ہوا ملا۔ فارسی لغت کے ان دونوں لفظوں کے اردو میں غلط استعمال اور اس کے سلسلہ میں ہونے والی غیر محسوس ''تحریف معنوی'' کے بارے میں فارسی زبان ہی میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ؏

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

کیوں کہ یہ وہ غلطی ہے جس کی طرف عوام ہی نہیں، بہت سے اہل علم بھی توجہ مبذول نہیں کرتے؟۔ مختصر قابل ذکر بات یہ ہے کہ ''خرد'' کے معنی چھوٹا ہیں، جب کہ ''خورد'' کے معنی اس نے کھایا۔ ایسی صورت میں ''خرد'' کے مقام پر ''خورد'' لکھنا کیسا ہے؟ —— اس کا فیصلہ کرنے کے لئے بہت زیادہ علم کی نہیں، بس توجہ کرنے کی ضرورت ہے؟؟۔

یہ بات تو ''جملہ معترضہ'' کے طور پر اس لئے بیان کردی گئی کہ ممکن ہے کہ پوری روداد سفر میں یہی ایک بات کچھ قارئین کے لئے لائق توجہ بن جائے، اور بڑے پیمانے پر ہونے والی اس غلطی کی کسی قدر اصلاح کا ذریعہ میری یہ تحریر بن جائے؟۔

نوچندی ایکسپریس سے (جس کا نام خیر سے اب تبدیل ہوکر پریاگ راج سہارنپور ایکسپریس ہوگیا ہے ——) تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے؟) کئے جانے والے اس سفر کا پہلا خوشنما منظر تو یہ سامنے آیا کہ اچھا خاصا اے سی سکنڈ کوچ بالکل جنرل کلاس یا زیادہ سے زیادہ سلیپر کلاس لگ رہا تھا۔ ''کرونا پروٹوکال'' کی رعایت میں مسافروں کے تحفظ کے پیش نظر ہمارے محکمہ ریل نے نہ صرف تمام پردے ہٹادیئے ہیں بلکہ ضابطہ کے مطابق چادر تکیہ اور کمبل وتولیہ کی فراہمی بھی بند کردی گئی ہے۔ تا کہ انفکشن نہ ہوسکے؟ حالانکہ اس مد میں مسافروں سے وصول کی جانے والی رقم میں کوئی چھوٹ نہیں دی گئی ہے۔ جب کہ ''کرونا مارا ماری'' سے پہلے کی بات ہے کہ غریب رتھ جیسی مکمل اے سی ٹرینوں میں چوں کہ رعایتی کرایہ لیا جاتا تھا اس لئے اس میں چادر کمبل وغیرہ نہیں فراہم کیا جاتا تھا۔ اور اگر کوئی مسافر یہ سہولت لینا چاہتا تو اس کے لئے اس میں پچیس روپے الگ سے وصول کئے جاتے تھے —— تو کیا یہ مناسب نہ ہوتا کہ چادر کمبل وغیرہ کے نام پر لی جانے والی کم از کم یہی رقم عام ٹرینوں کے

اے سی کلاس کے مسافروں سے نہ لی جاتی؟۔ انصاف کی بات تو یہی ہوتی کہ جب سہولت نہیں تو سہولت کے نام پر لی جانے والی رقم بھی نہیں —— مگر توبہ کیجئے۔ ''بنیوں کا یہ حساب کتاب'' تو وہ لوگ سوچیں جن کا ''کچھ دینے'' کا تصور ہو؟، نہ کہ وہ لوگ جو موقع کا فائدہ اٹھا کر ''آپ کی مجبوری سے'' اس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں کہ ''کرونا'' کے حوالہ سے معذورین اور سینئر سٹیزن کی کرایہ میں دی جانے والی رعایتیں بھی ختم کردی گئیں۔ تا کہ ''مالدار عوام'' کی جیبوں سے رقمیں نکال کر ''غریب حکومت'' کے خزانوں کو بھرا جاسکے؟۔

یہ تو خیر ''کھلنے والی بات'' تھی جس کا ذکر کیا گیا —— اس سے زیادہ تکلیف کھڑکیوں اور کوچ میں داخلہ کے پردوں کے غائب ہونے سے ہوئی۔ پردوں سے ایک تحفظ اور ''پرائیویسی'' کا جو احساس ہوتا تھا وہ تو ختم ہوا ہی۔ یہ ستم بھی پوری رات جھیلنا پڑا کہ جب بھی کوئی اسٹیشن آتا تو پلیٹ فارم کی چکا چوند کردینے والی روشنیاں، بوگی کے ''عریاں شیشوں'' سے ٹکرا کر دوچند ہوجاتیں، اور منھ پر اچانک ڈائریکٹ تیز روشنی پڑتے ہی آنکھ کھل جاتی، اور پھر کچھ دیر کے لئے نیند اچٹ جاتی، کچھ کچھ وقفہ کے بعد اسی مرحلہ سے گذرتے اور سوتے جاگتے اللہ اللہ کر کے لکھنؤ سے مظفر نگر تک کا ٹرین کا یہ سفر صبح ۹ ربجے اختتام کو پہنچا تو چین کی گہری سانس لی۔

ٹرین سے وابستہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس ٹرین سے متعدد مرتبہ سفر ہوئے، لیکن ''کرونا کی برکت سے'' یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ جاتے اور واپس آتے ہوئے نوچندی جیسی لیٹ لطیفی کی عادی ٹرین بھی ایسی رائٹ ٹائم چلی جیسی ۱۹۷۵ء میں نافذ ہونے والی ایمرجنسی کے زمانہ میں ٹرینیں چلا کرتی تھیں —— اس تجربہ سے یہ سمجھ میں آیا کہ ہمارے ریلوے کو ''صعوبتوں کا دور'' بہت راس آتا ہے؟۔

اسی طرح لائق توجہ بات یہ بھی ہے کہ پردے نہ ہونے سے آمنے سامنے

کے مسافر خصوصاً خواتین اس احساس کی وجہ سے جھجک رہے تھے کہ ہماری ہر نقل وحرکت پر دوسروں کی نگاہ ہے۔اس ''عدم تحفظ'' کے احساس سے اسلام کے ''قانون حجاب'' کی حکمت و مصلحت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ پردہ خواتین پر کوئی جبر نہیں، بلکہ ان کی فطری شرم وحیا کی پاسداری کرتے ہوئے انہیں اپنے ''محفوظ'' ہونے کا احساس دلاتا ہے کہ اس کے ساتھ انہیں نقل وحرکت میں کوئی تکلف نہیں ہوتا —— کیا خوب یاد آئی اس موقع پر کلکتہ کی معروف ادیبہ کملا ثریا مرحومہ کی، جو بین الاقوامی اہمیت وشہرت کی حامل انگریزی زبان کی مصنفہ وادیبہ تھیں۔ پہلے وہ کملا داس ہوا کرتی تھیں اور اسی نام سے ساری دنیا میں ان کا تعارف تھا۔ چند برس پہلے جب انہوں نے بڑھاپے کی عمر میں اسلام قبول کیا اور نہ صرف اپنا نام تبدیل کر کے کملا ثریا کرلیا، بلکہ اپنے منتخب دین و مذہب اسلام کی تمام تعلیمات کو قبول کرتے ہوئے حجاب کی پابندی بھی شروع کردی تو پوری دنیا خصوصاً ہمارے ملک کے ذرائع ابلاغ میں جیسے ایک بھونچال سا آگیا —— کملاداس جیسی ادیبہ کا اسلام سے وابستہ ہوکر کملا ثریا بن جانا؟۔اور پھر ان جیسی ملکوں ملکوں گھومنے اور عالمی اہمیت کے حامل جلسوں، سمیناروں، اور کانفرنسوں میں مردوں کے دوش بدوش بے محابا شریک ہوتی رہنے والی ایک خاتون کا پابند پردہ ہوجانا؟ —— یہ وہ موضوعات تھے جو ہفتوں اخباروں کی زینت بنتے رہے، اور لکھنے والے ''اپنے اپنے ظرف و استعداد'' کے مطابق اس پر اظہار خیال کرتے رہے۔

اسی سلسلہ میں صحافیوں کی ایک جماعت نے ان کے گھر پہنچ کر ان سے تفصیلی انٹرویو کیا تھا، اور کملا داس نے اپنے کملا ثریا بننے کی داستان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا —— ایک صحافی نے جب ان سے یہ سوال کیا کہ اسلام کے قانون حجاب پر عمل کرنا آپ کا اختیاری ورضا کارانہ عمل ہے یا مذہبی مجبوری؟۔ اور آپ کو پوری زندگی ایک ''آزاد پنچھی'' کی حیثیت سے گذار کر عمر کے اس

آخری پڑاؤ میں پردہ کی پابندی کرتے ہوئے گھٹن کا احساس نہیں ہوتا؟۔

جواب میں کملا ثریا نے تفصیل کے ساتھ جو کچھ بیان کیا تھا وہ نہ صرف ان کے قلبی اطمینان، خواتین کے لئے اسلامی پردہ کی حکمتوں کے بیان، بلکہ فکر ونظر کی اس انقلابی تبدیلی کا بھی آئینہ دار ہے، جو انہیں نعمت اسلام کے واسطہ سے میسر آئی تھیں؟ انہوں نے بتایا تھا کہ جب میں ۷-۸/برس کی کم سن طالبہ تھی اور اپنے اسکول جانے کے لئے گھر سے باہر سڑکوں پر آتی تھی اسی وقت سے میں یہ دیکھ دیکھ کر بے چین ہوتی رہتی تھی کہ راہ چلتے کئی مردوں کی ''ہوسناک نظریں'' میرے چہرہ پر پڑ رہی ہیں —— پھر جوں جوں میری عمر بڑھی اور جوانی کی دہلیز پر میں نے قدم رکھا تو میری بے کلی و بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا، مگر میری مجبوری یہ تھی کہ میں کسی قانون کا سہارا لے کر ان ''ہوسناک نگاہوں کے تعاقب'' سے بچ نہیں سکتی تھی؟ اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کے قانون حجاب پر عمل کرتے ہوئے اب جو میں ''باپردہ'' باہر نکلتی ہوں تو مجھے ایسا قلبی سکون ملتا ہے جسے میں بیان نہیں کرسکتی۔ مجھے یہ سوچ کر بے پناہ مسرت ہوتی ہے کہ اب کوئی ''ہوس ناک نگاہ'' میرے چہرہ پر نہیں پڑ رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اسلام کے دامن رحمت میں پناہ لے کر مجھے بچپن سے آج کی اس عمر تک کی بے چینی کا علاج مل گیا —— پھر بھلا میں پردہ میں گھٹن کیوں محسوس کروں گی؟۔ کاش کہ مجھے حجاب کی یہ نعمت اس عمر ہی میں مل گئی ہوتی جب اس کی مجھے شدید ضرورت تھی؟؟۔

بہ ہر حال پردہ، پردہ ہی ہوتا ہے —— اور پردہ نہ صرف تحفظ فراہم کرتا ہے، بلکہ اپنے پیچھے چھپی ہوئی چیز کے باوقعت اور قیمتی ہونے کا بھی احساس دلاتا ہے۔ مگر اس کا احساس ان ہی لوگوں کو ہوسکتا ہے جو ''باپردگی'' اور ''بے پردگی'' دونوں کے لذت سے آشنا ہوں؟۔

---

۹ ربجے صبح کے قریب مظفرنگر ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہاں سے دس کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع بوڈینہ خرد کا سفر سڑک کے راستہ سے طے کر کے دس بجے سے قبل ہم لوگ وہاں پہنچ گئے۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ ناشتہ سے فراغت اور کچھ دیر ملاقاتیں اور آرام کر کے جمعہ کی نماز کے لئے مسجد پہنچے۔ بہت کچھ تبدیل ہوجانے کے باوجود گاؤں کے لوگوں میں آج بھی سادگی اور خلوص شہروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ پھر میں تو ''ایک معزز مہمان'' کے ساتھ ہی ''باہر سے آیا ہوا ایک مولوی'' تھا، اس لئے نماز جمعہ کی امامت مجھ ہی سے کرائی گئی۔ نماز سے فراغت کے بعد کچھ احباب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں بڑی عمر کے ایک صاحب، ایسے بھی ملے جن کی بوڈینہ میں سسرال ہے اور اسی نسبت سے وہ شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ کئی بچوں کے باپ ہونے کے باوجود وہ مظفرنگر ہی کے کسی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ جان کر واقعی خوشی ہوئی کہ حصول علم کی راہ میں انہوں نے بڑی عمر اور بال بچوں کو بھی نہیں حارج ہونے دیا۔ بعد نماز عصر اسی مسجد میں وہ نکاح ہوا جس میں شرکت، بلکہ نکاح پڑھانے کے لئے ہی میرا یہ سفر ہوا تھا۔ باقی جو کچھ ہوا وہ اسی کی برکت سے ہوا۔ نکاح سے قبل کچھ دیر نکاح، اس کی شرعی حیثیت، اور دینی و دنیاوی منافع کے سلسلہ میں میرا بیان بھی ہوا۔ جس میں دو باتیں خصوصیت کے ساتھ عرض کی گئیں۔ اول یہ کہ مسلمانوں کے لئے نکاح اور شادی ایک دنیاوی ضرورت کی تکمیل ہی نہیں ہے، بلکہ حکم خداوندی کی وجہ سے اس کی حیثیت ایک عبادت کی ہے اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والے دنیاوی منافع ضمنی ہیں۔ پھر جس طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ جیسی عبادات کا صرف حکم نہیں دیا، بلکہ شارع علیہ السلام نے پوری تفصیل کے ساتھ ان کی ادائیگی کا طریقہ، ان کی پابندیوں اور فائدوں حتیٰ کہ ان کے اوقات کو بھی بیان فرما دیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنی طرف سے کمی بیشی کر دے گا تو وہ

عبادت نہ عبادت رہے گی نہ ہی اس کے فائدے مل سکیں گے —— بس یہی معاملہ نکاح کا بھی ہے کہ جب اس کی حیثیت ایک عبادت کی ہے تو اس میں ''من مانیاں'' کرنے کی کہاں گنجائش ہوسکتی ہے؟۔ اور من مانیاں کر کے اس کے فوائد و برکتیں کیوں کر حاصل کی جاسکتی ہیں؟۔ لہٰذا نکاح کے ساتھ بارات، جہیز، و دیگر رسموں، اور دولت کی نمائش کو ''حوصلے و ارمان نکالنے کے نام پر'' شامل کرنے کی، شریعت تو کیا، عقل انسانی بھی اجازت نہیں دیتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم اور قابل لحاظ بات یہ بھی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے نہ صرف لڑکیوں اور لڑکوں کے نکاح کا حکم دیا ہے، بلکہ اپنی طرف سے اسے ''انشورڈ'' کرتے ہوئے یہ بھی فرمادیا ہے کہ ان یکونوا فقراء یغنیھم اللہ من فضلہ (نکاح کے وقت اگر لڑکے فقیر یعنی بے مال ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور نکاح کی برکت سے انہیں مالدار بنادے گا)۔ جب کہ آج کا ماحول یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے دیئے ہوئے اس انشورنس کا ہمیں کوئی لحاظ ہی نہیں ہوتا، اور اچھے خاصے دین دار کہلائے جانے والے لوگ بھی اپنی بہنوں، بیٹیوں کے رشتوں کے لئے سب سے پہلے لڑکوں کی مالی حیثیت کا پتہ لگاتے ہیں —— اور بسا اوقات لڑکے میں تمام خوبیاں ہونے کے باوجود صرف اس کی مالی حیثیت کمزور ہونے کی وجہ سے اس کا رشتہ یہ کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں کہ اس کے گھر میں میری بیٹی یا بہن کو میرے گھر جیسی راحت بھی نہیں مل سکے گی، اس سے بڑھ کر ملنے کا کیا تصور؟ حالاں کہ اللہ کی یقین دہانی اور ان کے دیئے ہوئے ''انشورنس'' پر ایمان و اعتماد ہو تو اللہ تعالیٰ کی مدد ضرور آئے گی اور وہی بے مال و زر لڑکا نکاح کی برکت سے آسودہ و مالدار ہوجائے گا —— بات صرف یقین و اعتماد کی ہے؟۔

دوسری بات نکاح کے تعلق سے یہ کہی گئی ہے کہ اسلامی قانون کے لحاظ سے نکاح ایک لڑکی اور ایک لڑکے کے عمر بھر ایک دوسرے کے مونس و غمخوار اور

دکھ سکھ کے شریک بن کر ساتھ نباہنے کا ایک ''ایگریمنٹ'' ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ لڑکی اپنی سب سے قیمتی متاع ''اپنی عفت وناموس'' لڑکے کے سپرد کرکے اسے بااختیار بناتی ہے، جب کہ لڑکا نکاح کے معاوضہ کے طور پر ''مہر'' دیتا ہے، اس معاہدہ یا ایگریمنٹ کے بعد شوہر اور بیوی دونوں پر ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی لازم ہوجاتی ہے، جس سے روگردانی کرنے کی کسی فریق کو اجازت نہیں ہوتی ہے۔ یعنی عام حالات میں کسی عذر کے بغیر نہ بیوی شوہر کا حق دینے سے انکار کرسکتی ہے، نہ ہی شوہر اپنی بیوی کا حق ''مہر'' ادا کرنے سے انکار یا ٹال مٹول کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر نکاح کے وقت ایک دوسرے کے حق کا کوئی ذکر نہ آیا ہو تو بھی نکاح ہونے کے بعد دونوں کے لئے اپنے اپنے فریضہ کی ادائیگی کرتے ہوئے ایک دوسرے کا حق دینا ضروری ولازمی ہوتا ہے۔ اور جس فریق کو اس کا حق نہ مل رہا ہو، وہ عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ اپنا حق حاصل کرنے کے لئے مجاز ہوگا—— جب کہ ہمارے مسلم معاشرہ میں عام طور پر مہر ادا کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں کی جاتی ہے اور خوشگوار ازدواجی زندگی میں کسی بیوی کے اپنے مہر کی ادائیگی کے مطالبہ کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ خیال عام ہے کہ مہر تو تب دینے لینے کی بات کی جاتی ہے جب طلاق، تفریق، یا موت کی وجہ سے رشتہ ٹوٹ جائے—— اچھے اور خوشگوار حالات میں مہر کا دینا لینا، اور اس کی بات کرنا تو گویا ''بدشگونی'' ہے؟۔ عام خیال کے مطابق چوں کہ مہر کو بیوی کے ایک ''شرعی حق'' کے بجائے نکاح کی ایک رسم قرار دیا جاتا ہے، اسی لئے فریقین کی حیثیتوں کی رعایت کئے بغیر اوٹ پٹانگ جو چاہے کم زیادہ مہر مقرر کرلیا جاتا ہے کہ یہ تو بس نکاح کی ایک رسم ہے—— کون دیتا ہے اور کون لیتا ہے؟۔

مہر اگر ''معجّل'' ہو تو اس کی ادائیگی تو فوری طور پر ہوجاتی ہے۔ لیکن اگر ہمارے ملک کے عرف عام کے مطابق مہر مؤجل (یعنی تاخیر اور مہلت کے

ساتھ حسب سہولت ادا کیا جانے والا) ہو تو اس کی ادائیگی کا خیال رفاقت کی لمبی لمبی عمریں گذار دینے پر بھی شاید ۲۵ رفیصد شوہروں کو بھی نہ آتا ہو؟—— حالاں کہ مہر ہر مسلمان بیوی کا ایک شرعی حق ہے، جس کی ادائیگی کی طرف مسلم شوہر کو ممکنہ عجلت وسہولت کے ساتھ اپنی توجہ مبذول کرنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے برموقع کہی گئی یہ دونوں باتیں توجہ کے ساتھ اور تائیدی انداز میں سنی گئیں۔ اس کے بعد نکاح مسنون ہوا۔

۲۷ رفروری کی دعوت عام میں (دعوت عام اس لئے کہ میرے داماد محمد شہزاد کے بڑے بھائی نوشاد صاحب نہ صرف ایک خوش حال کاشت کار ہیں بلکہ بہت ہی ہر دل عزیز شخصیت کے مالک ہیں۔ پورے ضلع کے مسلم وغیر مسلم حضرات سے ان کے روابط ہیں۔ سیاسی ذوق اور عملی طور پر اس سے وابستگی کی وجہ سے علمی ودینی شخصیات کے ساتھ ہی سیاسی لوگوں سے بھی ان کے مضبوط رشتے ہیں۔ اس لئے اس دعوت میں بلامبالغہ ہزاروں افراد شریک ہوئے، جس کا مجھے پہلے سے اندازہ نہیں تھا) میرے لئے خیر کا یہ پہلو برآمد ہوا کہ علاقہ کے بہت سے مقتدر حضرات، علمائے کرام، اور ذمہ داران مدارس سے ملاقاتیں ہوگئیں۔ علماء وحفاظ کے زمینی دسترخوان پر کھانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی اور ان کی پرخلوص دعوت پر چند مدارس میں حاضری دینے کا موقع بھی ملا۔

پروگرام کے مطابق ۲۸ رفروری کو صبح ناشتہ کے بعد دیوبند کا سفر عزیزم مولانا محمد بابر قاسمی کی معیت ورہنمائی میں ان ہی کی کار سے ہوا۔ دیوبند میں میرے ساتھ لکھنؤ سے آئے میرے بھتیجے عزیزی مولوی یاسر عبدالرحیم قاسمی سلّمہٗ پہلے سے مقیم تھے جو کہ اپنی اہلیہ کی چھوٹی بہن (دختر خواہرزادۂ عزیز مولانا ازہد مدنی سلّمہٗ) کی شادی میں شرکت کے لئے آئے تھے۔

دیوبند کی حدود میں داخل ہونے کے بعد ان کو فون کے ذریعہ اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ ان ہی کی ہمراہی میں سب سے پہلے حضرت مولانا ارشد

مدنی صاحب سے ملاقات کے لئے ان کے دولت خانہ پر حاضری ہوئی۔ جہاں عزیزان مولانا ازہد مدنی اور حسین مدنی سلمہما سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ کچھ دیر حضرت مولانا مدظلہ کی خدمت میں رہنے اور کچھ ہلکی پھلکی علمی گفتگو سے محظوظ ہونے کے بعد اندرون خانہ اپنی عم زاد بہن (اہلیہ مولانا ارشد مدنی صاحب) سے برسہابرس کے طویل وقفہ کے بعد چند منٹ کی ایک تشنہ سی ملاقات کے لئے حاضری دی تو ماضی کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ وہ تو مجھ سے گھر کے ایک ایک فرد کا نام لے لے کر خیر خیریت پوچھتی رہیں اور میں اس مختصر سی ملاقات کے دوران اس حسین ماضی کے خیالوں میں گم رہا۔ جب ہم سب لوگ لکھنؤ کے محلّہ پاٹا نالہ میں قریب قریب کے مکانات میں رہتے اور ایک دوسرے کے گھروں میں روزانہ آتے جاتے تھے۔ عم محترم مولانا عبدالمومن فاروقی مرحوم ایک شاندار وباوقار صحافی ومصنف ہونے کے ساتھ ہی ہم بچوں کے لئے اپنی شفقتوں کی وجہ سے بہت پرکشش تھے۔ اس لئے ان کے گھر پر کچھ زیادہ ہی وقت گذارا کرتا تھا۔ کئی برسوں کے بعد بہن صاحبہ سے ملاقات ہوئی تو بے ساختہ ماضی کے دریچے کھلتے گئے۔ وہاں سے نکل کر ازہد سلّمہٗ کے اصرار پر اسی کیمپس میں واقع ان کے مکان پر بھی چند منٹ کی حاضری درج کراتے ہوئے ہم لوگ مادر علمی دارالعلوم پہنچے۔ جہاں حاضری دینے ہی کے لئے دیوبند کا سفر ہوا تھا۔ حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مہتمم دارالعلوم کو ازہد میاں کے مکان ہی سے بذریعہ فون اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ اس لئے حضرت مہتمم صاحب کو دارالاہتمام میں اپنی آمد کا منتظر پایا۔ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے آج ہمارے سروں کا تاج اور ہمارا بھرم واعزاز ہیں ——— لیکن اس ’’خصوصی اعزاز‘‘ سے پہلے کا ایک طویل دوران کے ساتھ بے تکلفی اور ان کی مہمان نوازیوں سے لطف اندوز ہونے کا بھی گذر چکا ہے۔ دراصل حضرت مفتی صاحب بھی میرے دارالعلوم کے دور طالب علمی میں دارالافتاء کے ایک

طالب علم، اور استاذ محترم مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کے معتمد خاص تھے (جن سے بیعت کے بعد وہ ان کے خلیفہ ومجاز بھی ہوئے)۔ پھر دارالعلوم کے دور طالب علمی سے فراغت کے بعد حضرت مفتی ابوالقاسم صاحب کی پرخلوص دعوت پر مختلف دینی جلسوں کے مقرر کی حیثیت سے میرا برابر بنارس جانا ہوتا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے مفتی صاحب نے اعزازی طور پر مجھے اپنے ’’قریبی حلقۂ احباب‘‘ میں شامل کر رکھا تھا۔

یقیناً یہ مفتی صاحب کی تواضع وخردنوازی کی بات ہے کہ ان کے دور اہتمام میں ان سے ملاقات کے لیے پہلی مرتبہ دارالعلوم کے دفتر اہتمام میں حاضری دی تو انہوں نے عالم اسلام کے عظیم مرکز دارالعلوم دیوبند کے سربراہ اعلیٰ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اپنے ایک دیرینہ شناسا کی حیثیت سے میری طرف توجہ مبذول کی۔ فجزاه الله عنا خير الجزاء۔

وہیں دارالاہتمام میں دارالعلوم کے موجودہ دونوں نائب مہتمم اور اپنے دیرینہ رفیقوں حضرت مولانا عبدالخالق مدراسی صاحب اور حضرت مولانا عبدالخالق سنبھلی صاحب، نیز مفتی دارالعلوم اور اپنے قرابت دار حضرت مولانا مفتی زین الاسلام صاحب سے بھی ملاقاتیں ہوگئیں۔

اللہ تعالیٰ بہترین جزاء عطا فرمائے مفتی زین الاسلام صاحب کو کہ میرے گھٹنوں کے درد کی معذوری کی رعایت کرتے ہوئے نہ صرف دارالافتاء سے میری خاطر دارالاہتمام میں آکر ملاقات کی، بلکہ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تبرکات سے وابستہ دو بیش قیمت کتابوں ’’مأة دروس‘‘ اور ’’الانتباهات المفيدة عن الاشتباهات الجديدة‘‘ کی شرح ’’علم کلام جدید‘‘ کا بیش قیمت تحفہ بھی عطا کیا۔

’’مأۃ دروس‘‘ حکیم الامۃؒ کی معروف ونفع بخش کتاب ہے جسے ’’مختصر اسلامی انسائیکلوپیڈیا‘‘ کہنا مناسب ہوگا۔ کتاب کے سرورق پر اس کا تعارف

یوں کرایا گیا ہے:

""علم تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، اخلاق، قرأت وتجوید، سیرت، تاریخ، جغرافیہ، صرف ونحو، لغت، ادب، طب، فلسفہ، مناظرہ، ہیئت وغیرہ سے متعلق ضروری معلومات، نیز فرق ضالہ، احوال عصر، معروف شخصیات کے مختصر حالات، علمی وادبی لطائف جیسے متفرق اور متنوع عنوانات پر مشتمل ——— ایک سواہم سبق""

اس اہم تصنیف کی تصحیح وترجمہ کا کام مفتی زین الاسلام صاحب نے انجام دے کر اسے اپنے خصوصی اہتمام سے شائع کرایا ہے۔

دوسری کتاب جس کا اصل نام "الانتباهات المفيدة ...... الخ ،اور شارح کی طرف سے اس کا آسان نام ""علم کلام جدید"" رکھا گیا ہے۔ حضرت تھانویؒ کی یہ کتاب علم الکلام جیسے ادق اور مشکل موضوع پر ہے جس میں مصنف نے اسلام کے عقائد، اس کی عبادات، شریعت کے اصول اربعہ، نیز شریعت کی اخلاق، معاشرت، و دیگر معاملات کے سلسلہ کی تعلیمات اور ان کی حکمتوں کو عقل کی روشنی میں نہایت ہی عمدہ اور منظّم انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ جو علم الکلام کا اصل موضوع ہے۔ کتاب کی عبارات کا اپنے موضوع کی مناسبت سے مشکل ہونا اس کے نام ہی سے ظاہر ہے؟۔

مفتی زین الاسلام صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا حکیم فخر الاسلام مظاہری کو حق تعالیٰ نے اپنے اکابر خصوصاً حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ کے علوم ومعارف کو سمجھنے اور پھر اسے سہل وآسان زبان میں پیش کرنے کا خصوصی سلیقہ عطا کیا ہے اور انہیں حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ اور حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ و دیگر اکابر ومشائخ کے علوم ومعارف کو راقم الحروف اور اس جیسے عام لوگوں کے لئے قابل استفادہ بنانے کا شغف بھی ہے۔ چنانچہ انہوں نے پوری محنت وعرق ریزی کے ساتھ "الانتباهات المفيدة ...... الخ" کی تحقیق وتشریح نیز تسہیل

کر کے اسے شائع کرایا ہے۔ میرے لئے یہ کتاب دراصل ان ہی کی طرف سے ایک تحفہ ہے۔

موصوف کا قیام بھی جامعہ طبیہ کے ایک لائق استاذ کی حیثیت سے دیوبند میں ہے۔ لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے ان سے ملاقات تو نہیں ہوسکی، لیکن برادر اکبر کے توسط سے ان کے اس علمی تحفہ سے مستفید ہونے کا موقع ضرور مل گیا۔ فجزاهما الله احسن الجزاء۔

دارالعلوم کے پرشکوہ دروازوں کو، اس کی وسیع وعریض عمارات کو، اس کے قدیم وجدید دارالاقامہ کو، اس کی روحانیت سے معمور درس گاہوں خصوصاً نودرہ، دارالتفسیر ودارالحدیث کو، فن تعمیر کی شاہکار جدید ترین کئی منزلہ دارالحدیث ولائبریری وغیرہ پر مشتمل عمارت کو، اس کے بیش قیمت و بے مثل کتب خانہ اور اس کے نوادر کو، اور اس کی عالی شان مسجد رشید کو دیکھنے اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس کی روحانی وعلمی فضاؤں سے استفادہ کے لئے ملک وبیرون ملک کے سیاح، ریسرچ اسکالر، اور عقیدت مند ہر سال ہزاروں کی تعداد میں پہنچتے ہیں۔ باذوق حضرات دارالعلوم کے ماہر فن اساتذہ کے تفسیر وحدیث اور عقائد وفقہ کے اسباق میں شرکت کی سعادت بھی حاصل کرتے ہیں ——— مگر میں کہ دارالعلوم کا ممنون احسانات اس کا برائے نام وادنیٰ طالب علم کچھ وقت کی قلت اور اس سے بڑھ کر بے تکلف چلنے پھرنے سے معذوری کی وجہ سے دفتر اہتمام کے سوا نہ کہیں جاسکا نہ دیکھنے کی طرح کچھ دیکھ سکا۔ ""کرونا"" کی مار کی وجہ سے درس گاہیں تو مقفل تھیں، لیکن جو دفاتر کھلے ہوئے تھے وہاں تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ دس برس سے زائد وقفہ کے بعد حاضری کے موقع پر کار میں بیٹھے بیٹھے ایک سرسری جائزہ سے یہ اندازہ تو بخوبی ہوگیا کہ اس مدت میں عمارات میں تجدید وتوسیع بھی بہت بڑے پیمانے پر ہوئی اور غالباً پانچ منزلہ وسیع وعریض اور خوبصورت دارالحدیث ولائبریری کی عمارت کا مستقل طور پر

اضافہ بھی ہوا ہے ——— گو کہ یہ میری پہلی حاضری تھی جب دارالعلوم میرے ان محسن اساتذہ اور مشفق مربیوں سے خالی تھا، جن کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، تاہم زمرۂ اساتذہ کی ایک بچی ہوئی شخصیت حضرت مولانا قمرالدین صاحب گورکھپوری کی خدمت میں بھی وقت کی تنگی کی وجہ سے حاضری نہیں دے سکا۔ حق تعالیٰ فیوض وبرکات کے ساتھ ان کا سایہ تادیر قائم رکھے۔ (آمین)

قلب ونظر میں کیف وسرور، اور انبساط ومسرت کا ایک جہان بسائے جب دارالعلوم کی حدود سے نکل رہا تھا تو اپنی تشنگی کو بہلانے کے لئے یہی گنگنا سکتا تھا کہ ع

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

دارالعلوم سے نکل کر دوسرے دارالعلوم یعنی دارالعلوم (وقف) میں تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی، حاضری بہ ہرحال درج کرانا تھی جس کی اصرار کے ساتھ میرے استاذ محترم حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کے جواں سال وجواں حوصلہ اور پرعلم وپرعزم پوتے جناب مولانا ڈاکٹر شکیب قاسمی صاحب نے میرے بھتیجے مولوی یاسر عبدالرحیم قاسمی سلّمہٗ کے توسط سے دعوت دے رکھی تھی جو دارالعلوم میں ان کے رفیق درس رہے تھے اور دیوبند میں میرے رفیق سیاحت تھے۔

کئی برس پہلے ''حکیم الاسلام سیمینار'' میں شرکت کی غرض سے دارالعلوم (وقف) میں حاضری ہوئی تھی ——— ایک طویل وقفہ کے بعد یہاں دوبارہ حاضری ہوئی تو احاطہ میں داخل ہونے پر اس کے وسیع وعریض رقبہ میں واقع جدید وخوشنما عمارات پر نظر پڑتے ہی دل باغ باغ ہوگیا۔ دارالحدیث کی وہ دل کش عمارت ہو جس کا نقشہ بڑے اہتمام کے ساتھ حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیریؒ نے بنوا کر اپنی خصوصی نگرانی میں اس کا تعمیری کام کرایا تھا، یا اس

ادارہ کی پیشانی کا جھومر ''حجۃ الاسلام اکیڈمی'' کی وہ خوش نما عمارت اور اس کی باسلیقہ آرائش، لائبریری اور فرنیچر، جس کے قیام سے لے کر اس کی تزئین تک، اور اس کے اہداف ودائرہ کار کی تعین سے لے کر اس کے لئے افراد کار کی فراہمی تک کا تمام تر سہرا اسی جوان صالح اور اپنے آباء صالحین کی وراثتوں کے امین مولانا محمد شکیب قاسمی کے سر بندھتا ہے جس کی پرعزم تگ ودو، اور اس کے برآمد ہوتے ثمرات کے لئے یہ کہنا شاید مناسب ہی ہو کہ ؎

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

گو کہ درس گاہیں یہاں بھی تعلیمی نظام کے باقاعدہ بحال نہ ہونے کی وجہ سے مقفل، اور دارالاقامہ کے کمرے سنسان تھے ——— مگر اس کے تعمیر شدہ دفاتر، درس گاہوں، اور دارالاقامہ کی عمارتیں ہوں یا زیر تعمیر وسیع وعریض مسجد اور ''حجۃ الاسلام اکیڈمی'' کا قیام ہو، ہر چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ان شاء اللہ اب اس ادارہ سے بھی بڑے پیمانہ پر دین وعلوم دینیہ کی نشر واشاعت کا کام ہو کر رہے گا؟۔

''حجۃ الاسلام اکیڈمی'' کے باہر ہم لوگوں کا استقبال اس کے سربراہ نے کیا، اندر جا کر اکیڈمی کی لائبریری، اور باسلیقہ مطالعہ کی میز وکرسیوں کو دیکھ کر دل نے بے ساختہ صدا دی ''ہم بھی کسی سے کم نہیں'' اکیڈمی کی مطبوعات اور مستقبل کے منصوبوں کے سلسلہ میں مولانا محمد شکیب قاسمی اور ان کے معاون خاص مولانا محمد نوشاد صاحب سے کچھ تفصیلات کا علم ہو کر بہت خوشی ہوئی۔ خصوصاً یہ اطلاع بہت امید افزا تھی کہ اکیڈمی کی اب تک شائع ہونے والی تمام کتابیں اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں شائع ہوئی ہیں۔ اور حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی کے علوم ومعارف پر جو تحقیقی کام ہو رہا ہے، اور ان کی تصنیفات کی تشریح وتسہیل کے لئے جو محنتیں ہو رہی ہیں، ان کی اشاعت

بھی ان شاء اللہ تینوں زبانوں میں ہوگی۔

اس مختصر لیکن بہت کار آمد و مسرت افزا ملاقات کے اختتام پر مولانا محمد شکیب صاحب نے تینوں زبانوں میں شائع شدہ متعدد قیمتی و ضخیم کتابوں کا ''علمی تحفہ'' بھی بڑی فیاضی کے ساتھ عطا کرکے اور آئندہ بہ شرط حیات اس ''تشنہ ملاقات'' کی تلافی کا وعدہ لے کر ہم لوگوں کو رخصت کیا۔

وہاں سے بہ عجلت تمام واپسی پر ہم لوگوں کو مظفر نگر شہر پہنچ کر دعوت ولیمہ میں شریک ہونا تھا۔ راستہ میں وقف دارالعلوم کے مہتمم برادرم جناب مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب کا فون ملا، اور انہوں نے ایک تقریب میں شریک ہونے کی وجہ دیوبند سے باہر ہونے اور ملاقات نہ ہونے پر اپنے افسوس کا اظہار کیا ——— ساتھ ہی پھر مستقبل قریب میں دیوبند اور اپنے ادارہ میں آنے کی دعوت دی۔ یوں تو منصور پور گاؤں سے ہمارا رشتہ بھتیجی (دختر برادر مکرم پروفیسر عبدالحی فاروقی مرحوم) کی سسرال ہونے کی وجہ سے بہت پرانا تھا، لیکن ابھی تک منصور پور جانا نہیں ہوسکا تھا۔ حالاں کہ میری بھتیجی اور اس سے بڑھ کر اس کے شوہر یعنی میرے داماد (جواب سمدھی بن بن چکے ہیں) سید محمد ساجد نے شادی بیاہ جیسی تقاریب کے حوالہ سے متعدد مرتبہ باصرار منصور پور کی دعوت بھی دی۔ پھر ان کے بیٹے عزیزم مولانا محمد عدنان قاسمی کے ساتھ میری حقیقی بھتیجی (دختر برادرم مولانا عبدالولی فاروقی) کی شادی ہوجانے کی وجہ سے منصور پور کی حیثیت میرے لئے ''ڈبل سمدھیانے'' کی ہوگئی تھی۔ ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے سفر کا ارادہ بھی کرلیا تھا جو عین وقت پر ملتوی کرنا پڑا تھا ——— بات سچی اور سو ٹکے کی یہی ہے کہ انسان سوچ سکتا ہے، ارادہ کرسکتا ہے، مگر ''اوپر'' کی منظوری کے بغیر اس ارادہ کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا ہے؟۔

صرف ایک دن پہلے بوڑینہ خرد کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے مولانا عدنان قاسمی سلّمہٗ آئے تو انہوں نے اپنے والد محمد ساجد کی طرف سے

بہت اصرار کے ساتھ ایک مرتبہ پھر منصور پور آنے کی دعوت دیتے ہوئے یہ بھی پیش کش کی کہ ابھی اپنے سہ روزہ بقیہ قیام کے دوران جس دن آپ کہیں میں خود آکر اپنے ساتھ آپ کو لے جاؤں؟۔ میں نے ''عزم مصمم'' کے ساتھ منصور پور اس مرتبہ پہنچنے کا وعدہ تو کرلیا، لیکن پہنچنے کی تاریخ اور وقت کے سلسلہ میں اس وقت یہ طے پایا کہ کل شام کو بذریعہ فون اس کی اطلاع کردی جائے گی۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ عرفتُ ربی بفسخ العزائم (میں نے اپنے مضبوط ارادوں کے ٹوٹنے سے اپنے پروردگار کو پہچانا) چنانچہ میرے ساتھ بھی یہی ہوا کہ دوسرے دن کی شام آنے سے پہلے ہی یہ سوچ کر کہ ابھی شام تک کا وقت ہے اور جائے دعوت ولیمہ سے منصور پور قریب بھی ہے۔ میں اپنے داماد محمد شہزاد کو ساتھ لے کر منصور پور پہنچ گیا (جس کی اطلاع فون سے عدنان سلّمہٗ کو دے دی گئی تھی) عدنان سلّمہٗ کے والد سید محمد ساجد منصور پور کے خانوادۂ سادات کے ایک خوش حال اور متمول کاشت کار ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے استاذ اور کارگذار مہتمم حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب سے ان کی قریبی رشتہ داری ہے۔ وہ بہت ہی ملنسار، متواضع اور مرنجان مرنج آدمی ہیں۔ اپنے گھر منصور پور میں (جسے وہاں کے عرف میں دربار کہا جاتا ہے، دربار کی وہ عمارت ابھی بھی موجود ہے جہاں ماضی میں کبھی واقعی دربار لگا کرتا تھا) مجھے پاکر وہ بے حد خوش ہوئے کیوں کہ ان کی برسہا برس پرانی خواہش کی تکمیل ہوئی تھی۔ میری بھتیجی (اہلیہ ساجد) بھی بہت خوش ہوئی۔ جب کہ میری حقیقی بھتیجی (اہلیہ عدنان سلّمہٗ) ان دنوں اپنے مائیکہ لکھنؤ میں تھی۔ بہ ہر حال اس گھریلو قسم کی مختصر پر مسرت ملاقات کے بعد عدنان سلّمہٗ مجھے اپنا مدرسہ دکھانے کے لئے لے گئے، جو انہوں نے اپنی وسیع آبائی زمین پر قائم کیا ہے۔ مدرسہ ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ جہاں حفظ قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آٹھویں جماعت (جونیئر ہائی اسکول) تک کی تعلیم کا باقاعدہ و منظور شدہ نظم ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس مدرسہ

کو قبول فرما کر اسے دینی وعصری تعلیم کا ایک بڑا وقابل اعتماد مرکز بنائے۔ (آمین) مدرسہ میں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد عدنان سلّمہٗ نے اپنی کار سے ہم لوگوں کو پھر دعوت کے مقام تک پہنچا دیا۔ جہاں سے ہم لوگ دوسری کار کے ذریعہ نماز مغرب سے قبل ہی بوڈینہ واپس آگئے۔ فالحمدللہ

۲۸/فروری کا دن بہت مشغول گذرا۔ اللہ تعالیٰ نے وقت میں خوب برکت عطا فرمائی۔ دعوت میں شرکت بھی ہوئی اور دیوبند سے لے کر منصور پور تک کے دو قسطوں میں سفر بھی ہوگئے۔ احباب و اعزہ سے ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ دیوبند کے دونوں بڑے اور قابل ذکر اداروں کی سرسری ہی سہی، بہ ہر حال زیارت کا موقع بھی ملا اور قبرستان قاسمی پہنچ کر اپنے اساتذہ واکابر کے لئے فاتحہ خوانی کی سعادت بھی حاصل ہوگئی۔ عام حالات میں ایک مختصر وقت میں اتنی بھاگ دوڑ سے اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے تکان ہوجایا کرتی ہے۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم رہا کہ پوری نشاط وچستی کے ساتھ بوڈینہ واپس آکر وہاں سکون واطمینان کی رات گذاری۔ فلہ الحمد و الشکر۔

دوسرے دن یکم مارچ کو بعد نماز ظہر قریب کے ان دو مدرسوں میں جانا ہوا جہاں کے ذمہ داروں نے بہت خلوص واصرار کے ساتھ دعوت دی تھی۔ اس سے قبل دوپہر کے کھانے پر نوشاد صاحب کے گھر میں دارالعلوم کے مفتی جناب مولانا محمد نعمان صاحب سیتاپوری سے ملاقات ہوئی جو بروقت شادی کی تقریب میں شریک نہ ہوسکنے کے بعد اپنی اہلیہ کے ساتھ نوشاد صاحب کے گھر شادی کی مبارک باد، اور کسی نہ کسی درجہ میں اس میں شرکت کے لئے دیوبند سے آئے تھے۔

مفتی صاحب ایک جوان العمر اور صالح وباعمل عالم دین ہیں۔ ان سے مختصر ملاقات بھی فرحت بخش ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ہم لوگ باغوں والی کے اس مدرسہ میں پہنچے جس کا نام دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانے میں

بہت سننے کو ملا تھا۔ ضلع مظفرنگر کے میرے ہم سبق کئی ساتھی بھی اس مدرسہ سے پڑھ کر آئے تھے۔ اس مدرسہ کا شمار ضلع کے بڑے مدارس میں ہوتا ہے۔ ابھی تک اس مدرسہ کو باغوں والی کے مدرسہ کے نام سے جانتا تھا۔ وہاں پہنچ کر علم ہوا کہ اس مدرسہ کا پورا نام مدرسہ اسلامیہ عربیہ خادم العلوم ہے اور اس کے موجودہ سربراہ ومہتمم بزرگ عالم دین حضرت مولانا حامد حسن صاحب ہیں۔ ''باغوں والی'' کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں میں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ غالباً یہاں باغات بہت رہے ہوں گے۔ اسی لئے اس بستی کا نام ''باغوں والی'' پڑا۔ تو مولانا نے میرے خیال کی تائید کی۔

حضرت مولانا حامد حسن صاحب ایک خلیق، متواضع اور باذوق عالم ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں اپنے اخلاق کریمانہ سے بہت متاثر کیا۔ کچھ دیر مولانا کے ساتھ ان کے دفتر اہتمام میں بیٹھنے اور ان کی ضیافت وعلمی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے بعد ان ہی کی معیت ورہنمائی میں مدرسہ کی وسیع وشاندار عمارات اور زیر تعمیر مسجد جدید کو دیکھتے بھالتے ہوئے ہم لوگ نماز عصر کی ادائیگی کے لئے مدرسہ ہی کے کمپاؤنڈ میں واقع دوسری مسجد پہنچے۔ اس دوران مولانا نے مدرسہ کے نظام تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں پوری واقفیت کراتے ہوئے بتایا کہ دارالاقامہ میں دو ہزار طلبہ کا قیام رہتا ہے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے (جس کی تفصیلات بھی مولانا نے بتائیں) عربی درجات میں جو طلبہ حافظ قرآن ہوتے ہیں، سالانہ امتحان سے قبل ان کو ایک ماہ کی مہلت دے کر قرآن مجید کا دور کرنے اور یادداشت کو تازہ ومستحکم کرنے کا موقع دیا جاتا ہے ــــــ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ قرآن مجید کے حفاظ نماز تراویح میں قرآن مجید سنانے کے لئے بالکل تیار رہیں، اور ان کا بچپن میں کیا ہوا حفظ قرآن، عربی تعلیم میں انہماک کی وجہ سے کمزور نہ ہونے پائے۔ اسی طرح طلبہ کی نماز باجماعت میں حاضری، نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن مجید کی پابندی،

اور شب وروز کی سرگرمیوں (جس میں کھیل کود کیلئے میدان وغیرہ بھی شامل ہے) کی تفصیلات معلوم کر کے خوشی ہوئی اور اندازہ ہوا کہ مدرسہ کے سربراہ و دیگر لائق اساتذہ اپنے طالب علموں کو ایک امانت سمجھ کر ان کو علم وعمل کے زیورات سے آراستہ کرنے میں اپنی بھرپور صلاحیتیں وتوانائیاں صرف کرتے ہیں۔حق تعالیٰ ان کی محنتوں کو ثمر بار کرے۔(آمین)

نماز عصر میں طلبہ کی اچھی اور معتد بہ تعداد کو دیکھ کر حیرت آمیز مسرت ہوئی۔پابندیوں کے اس دور میں اور مدارس کے دارالاقامہ میں ابھی تک طلبہ کی رہائش نہ ہوسکنے کے باوجود طلبہ کی اتنی بڑی تعداد کی موجودگی کے بارے میں استفسار کرنے پر یہ علم ہوا کہ لاک ڈاؤن کے دوران بھی کافی تعداد میں طلبہ دارالاقامہ ہی میں مقیم رہے۔نیز تمام درجات میں تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ جاری ہے۔خود مہتمم صاحب بھی کسی بڑی جماعت کا درس دیتے ہیں جس کا تعلیمی گھنٹہ انہوں نے ہم لوگوں کی آمد کی اطلاع پاکر دوسرے استاذ سے اس دن تبدیل کر کے ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی طلبہ کو سبق پڑھا دیا تھا——مہتمم صاحب کا یہ عمل بجائے خود اساتذہ کے لئے لائق تقلید اور ان کے احساس ذمہ داری کا آئینہ دار ہے۔

نماز عصر کے بعد طلبہ واساتذہ کے درمیان علم خصوصاً علم دین کی اہمیت وفضیلت اور طالبان علوم دینیہ کے مقام ومرتبہ کو موضوع گفتگو بنا کر ایک فرمائشی بیان ہوا۔جس میں خصوصیت کے ساتھ طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی عرض کیا گیا کہ آپ دوسروں کے بہکانے اور ورغلانے سے کسی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں،جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آپ ''مقدر کے سکندر'' اور خداوند قدوس کا خصوصی انتخاب ہیں۔کیوں کہ دنیا وعقبیٰ دونوں کے انعامات عطا کرنے والے منعم حقیقی نے دنیا اور اس کی نعمتیں دینے کے لئے کوئی شرط یا ''کوالیفیکیشن'' نہیں رکھی ہے——وہ مومن وغیر مومن،اور عالم وجاہل جسے چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔

جب کہ دین اور علم دین عطا کرنے کیلئے اولین شرط تو ایمان کی رکھی ہے۔پھر صاحب ایمان لوگوں میں سے بھی اس کا اپنا انتخاب ہوتا ہے؟۔قرآن براہ راست اس کا کلام ہے،احادیث اس کے پیارے حبیب اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ایک خزانہ ہے،اور دوسرے علوم دینیہ ان ہی کے تابع اور ان کے معارف وخزائن کے بیان وتشریح پر مشتمل ہیں——اب آپ خود ہی غور کر کے فیصلہ کریں کہ داد ودہش کے سلسلہ میں تو کسی انتخاب کی ضرورت نہیں ہوتی،نہ اس کے لئے کسی تعارف ہی کی حاجت ہوتی ہے،کیوں کہ سخی کے پیالے میں سب ہی کا حصہ ہوتا ہے——لیکن خزانوں کی چابیاں ہر ایک کو نہیں دی جاتی ہیں،بلکہ اس کے لئے صلاحیت کے ساتھ ہی اعتماد کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے،اور ''اعتماد وبھروسہ'' ایک ایسی چیز ہے جسے چیلنج بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ آپ کو فلاں شخص پر کیوں اعتماد ہے اور مجھ پر کیوں نہیں؟ جب کہ ان ان اضافی خوبیوں کی وجہ سے میں آپ کے معتمد شخص کے مقابلہ میں ارفع و اعلیٰ ہوں۔لہٰذا مجھ پر بھی اعتماد کیجئے؟۔اس احمقانہ طلب کا بس یہی ایک جواب ہے کہ تمہاری خوبیاں اپنی جگہ،مجھے اس شخص پر ہی زیادہ اعتماد ہے جس کا میں نے انتخاب کیا ہے——اس میں کیا اور کیوں کا کوئی دخل نہیں ہوا کرتا،نہ ہی زور زبردستی اور نسبتوں وقربتوں وصلاحیتوں کے حوالے دے کر اعتماد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کا اور آپ کے سینوں کا حق تعالیٰ نے انتخاب کر کے اپنے دین اور دینی علوم کی حفاظت وصیانت کا ذمہ دار بنایا ہے۔آپ ان شاء اللہ اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد ''نائب نبی'' جیسے معزز لقب سے یاد کئے جائیں گے۔کیا اس سے بڑھ کر بھی دنیا کی کوئی نعمت ہوسکتی ہے؟۔

بیان ختم ہونے کے بعد بلاتاخیر ہم لوگوں کو قریبی بستی بلاسپور کے ''جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ'' پہنچ کر نماز مغرب وہیں ادا کرنی تھی۔چلتے چلتے

حضرت مولانا حامد حسن صاحب نے اپنے زیر اہتمام شائع ہونے والی دو ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب ''اسلامی خطبات'' اس فرمائش کے ساتھ ہدیہ کی کہ میں اس کتاب کے بارے میں اپنے رسالہ ''البدر'' میں کچھ لکھ دوں ——— اس علمی تحفہ سے مستفید ہونے کا ابھی موقع نہیں مل سکا ہے۔ مطالعہ کے بعد ان شاء اللہ ''البدر'' میں اس پر تبصرہ شائع ہوگا۔

باغوں والی سے بوڈینہ واپس آتے ہوئے چند کلو میٹر پر واقع بستی بلاسپور جب ہم لوگ پہنچے تو نماز مغرب کا وقت قریب تھا۔ وہاں موجود اساتذہ کرام نے اپنے ناظم تعلیمات کی قیادت میں ہمارا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ مدرسہ کے سربراہ اعلیٰ حضرت مولانا محمد اسماعیل صادق صاحب شیخ الحدیث و مہتمم مدرسہ ہذا اس وقت مدرسہ میں موجود نہیں تھے، لیکن چند منٹ کے بعد ہونے والی نماز مغرب کی جماعت میں وہ بھی آ کر شریک ہوگئے۔ نماز کے بعد مہتمم صاحب و دیگر اساتذہ کرام سے ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو مہتمم صاحب نے مدرسہ کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم و تربیت سے نہ صرف زبانی طور پر آگاہی دی بلکہ اس سلسلہ کا مطبوعہ رسالہ اور اسی کے ساتھ دیگر مفید و کارآمد کتابیں بھی مرحمت فرمائیں۔ اس ادارہ سے ایک سہ ماہی رسالہ ''دعوۃ الصدق'' کے نام سے نکلتا ہے۔ علاقہ کے معروف عالم دین و بزرگ حضرت مولانا مفتی مہربان علی صاحب بڑوتی متوفی نومبر ۱۹۹۹ء مجاز و خلیفہ حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب سابق ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کا بلاسپور کے اس مدرسہ اور اس کے ذمہ داروں سے خصوصی ربط و تعلق تھا۔ ان کی وفات کے بعد مدرسہ کے ترجمان رسالہ ''دعوۃ الصدق'' کا اپریل تا ستمبر ۲۰۱۵ء کی اشاعتوں پر مشتمل $\frac{۱۸\times۲۲}{۸}$ سائز کے ۲۹۶ رصفحات پر مشتمل مجلد خصوصی نمبر شائع کیا گیا تھا، جس میں مولانا مفتی مہربان علی صاحبؒ کے احوال و آثار اور ان کی تعلیمی، تنظیمی، و اصلاحی خدمات پر متعدد مشاہیر و مستند اہل علم کے قیمتی مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔ جامعہ

فلاح دارین الاسلامیہ کے مہتمم حضرت مولانا محمد اسماعیل صادق صاحب نے دیگر قیمتی کتب کے ساتھ ''دعوۃ الصدق'' کا یہ خصوصی نمبر بھی ہدیہ میں دے کر اہل اللہ کے احوال سے واقفیت حاصل کرنے کا بھی ایک وسیلہ فراہم کیا۔ فجزاہ اللہ خیرا۔ چوں کہ بلاسپور کے اس مدرسہ میں میرے داماد شہزاد سلمہٗ کے دونوں بڑے بھائیوں محمد نوشاد و محمد ممشاد کے فرزندان عبداللہ و عبدالرحمٰن سلمہما بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس نسبت سے ان حضرات کو مدرسہ سے، اور مدرسہ کے ذمہ داروں کو ان حضرات سے ایک قسم کا خصوصی ربط و تعلق ہے۔ جس کا فائدہ کسی نہ کسی درجہ میں مجھے بھی ملا۔ اور ارباب مدرسہ کی پر خلوص گفتگو کے ساتھ ساتھ ان کی ''دعوت شیراز'' سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ان حضرات سے ملاقات اور مدرسہ و اس کی خدمات سے سرسری واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہم لوگوں نے اپنی قیام گاہ بوڈینہ خرد واپس آ کر نماز عشاء ادا کی۔ اور کھانا کھانے کے بعد وہیں آرام کیا۔ ام المدارس دارالعلوم دیوبند کے فیضان سے نہ صرف دیوبند اور ضلع سہارنپور، بلکہ قریبی اضلاع مظفر نگر، میرٹھ سے مرادآباد تک متعدد بڑے اور بافیض دینی مدارس ہیں جن کے ذریعہ علوم دینیہ کی نشر و اشاعت کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اکثر مدارس کی وسیع و شاندار عمارتیں ہیں اور مدارس طلبہ کی کثرت اور تعلیم و تربیت کے خصوصی اہتمام سے گلزار ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کہنا برحق ہے کہ ہمارے صوبہ اتر پردیش کے مغربی اضلاع کو مشرقی اضلاع پر برتری حاصل ہے۔ و ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

۲ر مارچ کو ہماری لکھنؤ واپسی کا ریزرویشن تھا، اس لئے اس دن کوئی پروگرام نہیں رکھا گیا۔ صبح ناشتہ کے بعد سے نماز ظہر تک قیام گاہ ہی پر گاؤں کے مخلص احباب واعزہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔ نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد کھانا اور کچھ دیر قیلولہ کے بعد اول وقت میں نماز عصر کی ادائیگی کے بعد ہم لوگوں کی

بذریعہ کار میرٹھ کے لئے روانگی ہوئی۔ اور اعزہ واحباب نے بہت ہی خلوص اور پھر جلد ہی آنے کے اصرار کے ساتھ ہمارے مختصر کارواں کو رخصت کیا۔

میرٹھ پہنچ کر ہم لوگوں نے اسٹیشن کے قریب واقع مسجد میں مغرب کی نماز باجماعت ادا کی۔ اور عشاء کا وقت آنے سے پہلے ہی ٹرین میں سوار ہو کر نماز عشاء ٹرین ہی میں ادا کی۔ ٹرین اپنے وقت مقررہ پر روانہ ہو کر اپنے مقررہ وقت سے چند منٹ قبل ہی لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ پلیٹ فارم کے باہر میرے دو بیٹے مفتی حارث عبدالرحیم قاسمی اور مولوی معاویہ عبدالرحیم ندوی سلمہما اپنی رات کی نیند قربان کر کے پہنچ چکے تھے، جس کی اطلاع انہوں نے فون کے ذریعہ ہم لوگوں کو دے دی تھی۔ حق تعالیٰ والدین کی سہولت کے لئے اس ایثار کا ان دونوں کو بہترین صلہ عطا فرمائے۔ (آمین)

اسٹیشن سے ہم میرٹھ سے آنے والے ساڑھے چار مسافر دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ شہزاد سلّمہٗ اپنی اہلیہ اور خرد سال بیٹے دانیال سلّمہٗ کے ساتھ اپنے گھر کے لئے اور ہم چاروں دونوں بیٹے اور ان کے والدین اپنے گھر کے لئے روانہ ہو کر نماز فجر سے کافی پہلے گھر پہنچ گئے۔ اور آدھا گھنٹہ سے زائد انتظار کے بعد باجماعت نماز فجر ادا کی۔

اس طرح ۶ رشب اور پانچ دنوں کا یہ دلچسپ و بامراد سفر اختتام کو پہنچا۔

فللہ الحمد رب العالمین

ایک درپیش سفر

اپنے منتخب سفرناموں پر مشتمل اس کتاب میں ایک ایسے سفر کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھا جو یقینی تو اتنا ہے کہ اسے دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے عذر کے ذریعہ بھی ٹالا نہیں جا سکتا ہے۔ اس سفر کے لئے رزرویشن بھی ہو چکا ہے، لیکن گھبراہٹ اس بات سے ہے کہ مقررہ تاریخ اور وقت پر سفر کی لازمی پابندی کے باوجود سفر کی تاریخ اور وقت نہ مجھے معلوم ہے، نہ ہی کوئی ایسا ذریعہ دستیاب ہے جس سے اس کا پتہ لگایا جا سکے —— بس جب مقررہ تاریخ میں مقررہ وقت آجائے گا، سفر کرنا ہی ہوگا؟۔

احوال سفر کا ذکر کیسے کیا جائے کہ مسافر کو خود ہی نہیں معلوم کہ کیا بیتے گی؟ امید وبیم سے دو چار مسافر نے اپنی غفلت کوشی، اور ''غیبی مدد'' کی امید پر سامان سفر بھی کچھ نہیں کیا ہے۔ حالانکہ دنیا کے دن دو دن کے سفر کے لئے بھی کچھ نہ کچھ تو سامان سفر کرنا ہی پڑتا ہے؟۔ کچھ نہیں تو معمولی چلت پھرت کے لئے بھی ''عصائے پیری'' اور بیماریوں کی دوائیں تو لے کر چلنا ہی پڑتا ہے —— جب کہ ایک ایسے سفر کے لئے جس سے پھر واپسی بھی نہیں ہونا ہے ''سامان سفر'' کے نام سے کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ''غیبی مدد'' ہی کا سہارا ہے؟۔ اتنا تو معلوم ہے کہ اس سفر کا نام ''سفر آخرت'' ہے، جس کی پہلی منزل یا پہلا اسٹیشن قبر ہے۔ اور اسی منزل میں یہ فیصلہ ہونا ہے کہ آگے کی منزلوں میں کیا بیتے گی؟ سکون وراحت، اور عیش و آرام سے بھرپور من چاہی زندگی ملے گی، یا خدانہ خواستہ

اپنے کئیے کا بھگتان بھرنا پڑے گا؟۔

اب جب کہ رکارڈ کے اعتبار سے عمرِ رواں کی ساتویں دہائی بھی پوری ہونے کے قریب ہے، اور رحیم وکریم رب نے کسی استحقاق وصلاحیت کے بغیر قسم قسم کی نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ دنیا اور متاعِ دنیا کی ایسی کوئی چاہت نہیں ہے جو ہمارا پروردگار اپنی شانِ عطا وبخشش سے پوری نہ کر دیتا ہو —— ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ عمرِ طبعی تک پہنچ جانے ہی پر "موت" کی آہٹ محسوس کر کے کچھ "سامانِ سفر" کرنے کی فکر ہوتی! مگر "داورِ محشر" اور "شافعِ محشر" کی نسبتوں نے کچھ اس طرح خود فریبی میں مبتلا کر رکھا ہے کہ "بارِ عصیاں" کا کچھ احساس ہی نہیں ہے۔

اللہ اور اس کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کی وجہ سے "سرخ رو" ہو جانے کی امید تو لگا رکھی ہے، لیکن اللہ اور اس کے پیغمبر کو راضی رکھنے کی کوئی لگن نہیں ہے —— یعنی بخشش وشفاعت کے امیدوار تو ہیں لیکن اپنے آپ کو اس کا اہل بنانے کی فکر دامن گیر نہیں ہے۔

اللہ کے نیک، پارسا، اور پسندیدہ بندوں کا تو یہ حال بہ چشمِ خود دیکھا کہ وہ دنیا ومتاعِ دنیا سے یکسو ہو کر اپنے خالق ومالک کو منانے کے سو سو جتن کرنے کے باوجود مطمئن وقانع نہ ہو کر ہر دم حیرانی وپریشانی کے عالم میں سرد آہیں بھرتے اور اشک فشانی کرتے رہتے تھے۔ دیگر کئی اہل اللہ کے ساتھ ہی مرشدِ اعظم، ولی کامل حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحبؒ مجاز وخلیفہ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی، سابق ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کو تو متعدد بار اس حال میں پایا کہ کوئی طالب توجہ ودعا حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بامراد ہوا۔ پھر جب وہ رخصت ہونے لگا تو خود حضرتؒ با چشمِ پُرنم اس سے درخواست گذار ہوئے کہ "دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان پر خاتمہ کرے۔ بڑی سخت منزل ہے"۔ یہ ہے اپنے خالق ومالک کی رضا جوئی کا انداز، اور فکر

آخرت کی وجہ سے بے چینی وبے قراری کی حالت، جوان باسعادت وخوش نصیب بندوں کے حصہ میں آتی ہے جنہیں حقیقی معنوں میں اہل اللہ کہا جا سکتا ہے۔

اور تو اور خود مرادِ نبی، مطلوبِ نبی، اور اس دنیا ہی میں پیغمبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حقیقت بیان سے جنت کی بشارت پانے والے خلیفۂ راشد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر جب بدبخت ابولولو فیروز مجوسی نے محرابِ نبی کے اندر حالتِ نماز میں قاتلانہ حملہ کیا، اور وہ شدید زخمی حالت میں اٹھا کر گھر لائے گئے، پھر تین دن کے بعد ان ہی زخموں کی تاب نہ لا کر ان کی شہادت ہوئی، تو ان تین دنوں کے دوران بار بار وہ اپنی پیشانی زمین پر رگڑ رگڑ کر یہ شعر پڑھتے ۔

ظَلُوْمٌ لِنَفْسِیْ غَیْرَ اَنِّیْ مُسْلِمٌ
اُصَلِّی الصَّلٰوۃَ کُلَّهَا وَ اَصُوْمُ

(یعنی میں نے اپنے آپ پر ظلم ہی ظلم کیا ہے، سوائے اس کے کہ نمازیں پڑھتا اور روزے رکھتا رہا ہوں)

اپنے آقا اور پیغمبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نہ صرف متعدد مرتبہ جنتی ہونے کی بشارت پانے، بلکہ یہ سن لینے کے بعد بھی کہ "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا (یعنی میں اللہ کے فیصلہ کے مطابق اس کا آخری نبی نہ ہوتا) تو وہ عمرؓ ہوتے" —— ان سب کے باوجود جب انہیں اپنے رب کے انعامات یاد آتے، اور اس کے حقوق کی ادائیگی کا خیال آتا تو وہ بے چین ہو جاتے۔ انہیں اپنے تمام اعمالِ صالحہ، اپنے رب کے حقوق کے مقابلہ میں ہیچ نظر آتے۔ اور وہ تڑپ کر زبانِ شاعر میں اپنے رب سے یوں فریادی ہوتے کہ ۔

رحم کر اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں یا رب تو نہ ہم کو بھول جا

ان ہی حضرت عمر فاروقؓ کا ایک واقعہ تو اس قدر چشم کشا اور عبرت آموز ہے کہ راقم الحروف جیسے آلودۂ عصیان کو بھی خواب غفلت سے جھنجھوڑ کر بیدار کر دینے کے لئے کافی ہے ——— ہوا یوں کہ صحابی رسول حضرت حذیفہ بن یمان، ''صاحب سر رسول اللہ'' (حضرت حذیفہ بن یمان وہ خوش بخت صحابی ہیں، جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا رازدار بنانے کا شرف بخشتے ہوئے انہیں اس تاکید کے ساتھ فتن وملاحم کے سلسلہ کی کچھ باتیں بتائی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں وہ راز کی باتیں کسی کو نہیں بتائیں گے۔ جس کی حضرت حذیفہؓ نے مکمل پاسداری بھی کی۔ اسی خصوصی شرف کی وجہ سے حضرت حذیفہ بن یمانؓ کو ''صاحب سر رسول اللہ'' یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) نے ایک مرتبہ مجمع عام میں فرمایا کہ ''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رازدارانہ طور پر ایک ایک منافق کا نام بتایا ہے، جنہیں میں پہچانتا بھی ہوں۔ لیکن اس راز کا افشا کر کے رسوائی کا سامان نہیں کرنا چاہتا ہوں'' ——— یہ سن کر حضرت عمرؓ کے ہوش اڑ گئے، بے کلی، بے قراری، اور امید وبیم کی کیفیات لئے حضرت حذیفہؓ کے پاس تنہائی میں پہنچ کر یوں عرض گذار ہوئے کہ ''حذیفہؓ میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راز افشا کرنے کے لئے نہیں کہتا، البتہ صرف اتنا بتا دو کہ ان منافقین میں آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام تو نہیں لیا تھا؟ ——— جواب میں جب حضرت حذیفہؓ نے ان کے فضائل ومناقب بیان کرتے ہوئے ان کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف وصریح جنتی ہونے کی بشارتوں کا ذکر کر کے ان کے نہ صرف مومن صادق، بلکہ ''مراد ومطلوب اور ثمرۂ دعائے نبیؐ'' ہونے کی یاد دہانی کرائی، تب حضرت عمرؓ کو قرار آیا؟۔

اسی سلسلۂ زریں کا وہ واقعہ بھی کم اہمیت کا حامل نہیں کہ جب صحابی رسول حضرت حنظلہؓ حیران و پریشان با چشم گریاں، یارِ غارِ نبی سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے

ساتھ دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ نَافَقَ حَنْظَلَةُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ (اے اللہ کے رسول! حنظلہ منافق ہو گیا ہے) اس ''حیرت انگیز انکشاف'' کے سلسلہ میں استفسار کرتے ہوئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علامت نفاق دریافت کی۔ اور جواب میں حنظلہ نے اپنی دلی کیفیت بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! جب آپ کی خدمت میں حاضر رہتا ہوں تو ایمان ویقین کی دوسری کیفیت رہتی ہے، اور جب آپ کی مبارک مجلس کے باہر ہوتا ہوں تو دوسری کیفیت ہو جاتی ہے۔ پھر ایمان ویقین کی وہ کیفیت نہیں رہ پاتی جو آپ کی مبارک مجلس میں ہوتی ہے ——— اور منافق وہی تو ہوتا ہے جس کے دو چہرے ہوں۔ آپ کی مجلس میں کچھ، اور آپ کی مبارک مجلس کے باہر کچھ؟۔ اور جب دلِ بیمار کے طبیب حاذق، چارہ گر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے ''اپنے حنظلہ'' کو یقین دہانی کرائی کہ یہ نفاق نہیں، بلکہ ''عین ایمان'' ہے۔ کیوں کہ نبی کی مجلس کے اندر اور نبی کی مجلس کے باہر اگر دلی حالت میں یہ تغیر وتبدیلی نہ ہو تو نبی کے وفا شعار غلاموں کو نبی کی اہمیت کا اندازہ کیسے ہوگا؟۔ (اسی بات کو اپنے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام حنظلہؓ کو یہ باور کرایا کہ نبی کی حیثیت ''ایمان کے چارجر'' جیسی ہے کہ نبی کی موجودگی میں ان کے وفا شعار غلاموں کے ''ایمان کی بیٹری'' مکمل طور پر چارج رہتی ہے۔ جب کہ ''چارجر'' سے ہٹنے کے بعد ''ایمان ویقین کی بیٹری'' کی وہ حالت نہ رہنا ہی فطری بھی ہے اور ضروری بھی؟۔)

اس تشریح ویقین دہانی کے بعد ہی اپنے ایمان ویقین کے سلسلہ میں حضرت حنظلہؓ کو شرح صدر ہوا۔

اللہ اللہ! ایک طرف انسانی تاریخ کی سب سے مقدس ومعتبر جماعت صحابہ کرامؓ کی فکرمندی کا یہ عالم کہ پل پل کی دلی کیفیات پر پینی نگاہ، اور ہر لحظہ ''انجام بخیر'' ہونے کے لئے کوشاں و سرگرداں ——— دوسری طرف راقم

الحروف جیسے ''موروثی ایمان والے'' کہ جن کو نہ اس عظیم نعمت کو حاصل کرنے کے لئے کوئی جدوجہد کرنا پڑی، نہ اس کے حصول وبقا کے لئے کوئی قربانی دینی پڑی، بلکہ یہ نعمت ماں کی گود ہی سے حاصل ہوگئی ——— اسی لئے کائنات کی اس سب سے بڑی نعمت کی ناقدری کا یہ عالم کہ جیسے ایمان پر ہماری ''بپوتی'' ہے؟۔ نہ یہ نعمت ہم سے چھن سکتی ہے نہ کم ہوسکتی ہے ——— غفلت وبےفکری کا یہ عالم کہ ''موت کی لگار'' پر آجانے کے باوجود بھی شیطان کے تسلط کی وجہ سے نہ آخرت کے سفر کا خیال، نہ اس کے لئے سامان سفر کرنے کی کوئی فکر!۔ موت کا یقین ہونے کے باوجود موت کے بعد کی منزلوں کے لئے کوئی تیاری، نہ قبر کی پہلی منزل کی ''سخت پرسش'' کی طرف کوئی توجہ، نہ قبر میں آنے والے فرشتے کے سوالوں کے صحیح صحیح جواب دے کر آگے کی منزلوں میں سرخ روئی وکامرانی حاصل کرنے کی کوئی لگن نہ ہی اس کے لئے کوئی جدوجہد ——— غفلت ایسی کہ دبیز چادر تان کر سوئے ہوئے ہیں جیسے بس یہ دنیا ہی سب کچھ ہے۔ نہ اسے چھوڑ کر کسی دوسرے عالم کا سفر کرنا ہے، نہ ہی سامان سفر کرنے کا کوئی اہتمام ہے؟۔

میری اس تحریر کو پڑھنے والے میرے عزیز بھائیو! آپ کا یہ راقم الحروف بھائی ایک ''اقراری مجرم'' ہے۔ اس کے ''حال زار'' پر ترس کھا کر اس کے لئے دعا کیجئے کہ اس کو اگلے یقینی سفر کے لئے ''سامان سفر'' کرنے کی توفیق ملے ——— کیوں کہ ''پرسش کی منزل'' قریب ہونے کے باوجود اس کے لئے ابھی توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں جو موت سے ہم کنار ہوتے ہی بند ہوجائیں گے۔ پھر نہ سامان سفر کرنے کا موقع ملے گا، نہ ہی حسرت وندامت کچھ کام آسکے گی۔

ایسا بھی نہیں کہ فکر آخرت کرنے کے مواقع نہ ملے ہوں۔ مالک دوجہاں نے اپنے کرم سے گھر کا ماحول بھی اچھا عطا کیا، پھر والد ماجد رحمۃ اللہ

علیہ نے بہت ہی اصرار اور شدومد کے ساتھ دینی تعلیم میں لگایا۔ والد ماجدؒ کے عزم وثبات کے سلسلہ میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ان کے ایک مخلص وبے تکلف دوست نے ایک مرتبہ ازراہ مزاح والد صاحب سے کہا کہ آپ اپنے اتنے سمجھ دار وباصلاحیت لڑکے کو بھی اپنی ہی طرح کا مولوی بنارہے ہیں؟۔ ارے اس لڑکے کے اندر بڑی صلاحیتیں ہیں، اسے کسی اچھے اسکول، کالج میں داخلہ دلاکر آئی-اے-ایس یا انجینئر، ڈاکٹر بنائیے۔ یہ کیا مولویت کے چکر میں پھنسا رکھا ہے؟۔ جواب میں والد صاحبؒ نے بڑے سکون اور شرح صدر کے ساتھ فرمایا تھا کہ میں اپنی طرف سے تو اسے عالم باعمل ہی بناؤں گا ——— اس کے بعد اس کو انگریزی تعلیم کے لئے آزاد رکھوں گا، جتنی اور جب تک چاہے تعلیم حاصل کرے۔ میں اپنی زندگی میں اس کے اوپر کمانے کھانے کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالوں گا۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ اسے دینی تعلیم سے ہٹا کر صرف دنیا کمانے والی کسی تعلیم میں ڈال دوں ——— یہ میرا قطعی اور سوچا سمجھا فیصلہ ہے ——— والد ماجدؒ کے اس دوٹوک اور فیصلہ کن جواب سے ان کی اپنے بیٹے کے دین وعاقبت کے سلسلہ میں فکرمندی کا حال پوری طرح ظاہر ہورہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی نگرانی وسرپرستی میں ابتدائی تعلیم کے بعد ان اساتذہ کرام سے اکتساب فیض کے مواقع عطا کئے جن کے علمی فضل وکمال کے ساتھ ہی ان کی ورع وتقویٰ سے معمور عملی زندگی بھی لائق تقلید تھی۔ خصوصاً ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک کا سہ سالہ دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کا تو وہ دور تھا جس میں وہاں علم وعرفان کی ایک کہکشاں موجود تھی۔

ایک طرف مہتمم دارالعلوم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی عطر بیز شخصیت تھی، دوسری طرف شیخ الحدیث وصدرالمدرسین فخرالمحدثین حضرت مولانا فخرالدین احمد صاحبؒ جیسے علم وعمل کے کوہ گراں کی دل آویز وثمر بار شخصیت تھی۔ پھر ان کے درمیان شیخ مسلم شریف حضرت مولانا

شریف الحسن صاحبؒ، شیخ ترمذی شریف حضرت مولانا فخرالحسن صاحبؒ، شیخ ابوداؤد شریف حضرت مولانا عبدالاحد صاحبؒ ودیگر اساتذۂ کبار کی شخصیات سے کسب فیض کے بھرپور مواقع میسر تھے ــــ مگر وہی کفران نعمت کی قدیم روش، اور انجام سے بے پرواہ ہوکر آخری سفر کا سامان نہ کرنے کی ''احمقانہ بھول'' کا سلسلہ اس نوجوانی وطالب علمی کے دور سے آج بڑھاپے، اور بہ ظاہر اس دنیا کی اختتام پذیر زندگی تک جاری ہے ــــ بس اللہ ہی پر بھروسہ ہے۔ وہ کارساز بھی ہے، اور دلوں کو پھیرنے پر ہر وقت قادر بھی ہے۔ اسی سے دست بہ دعا ہوں کہ

''اے رحیم وکریم قادر ومقتدر رب! اپنے اس ناتواں اور نافرمان بندے پر رحم فرما، اسے اپنی فرماں برداری کی توفیق عطا فرما کر اس کا ''انجام'' بخیر فرما''۔

آخر میں سفر اور پھر سفر آخرت کے سلسلہ میں محی السنۃ حضرت مولانا ابرارالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نہایت ہی قیمتی اور سہل الحصول نصیحت کا ذکر کردینا بھی مناسب ہے:-

اپنی وفات سے کئی برس پہلے جب حضرت والا پوری طرح صحت منداور ہشاش بشاش تھے، لکھنؤ سے ممبئی کے لئے پشپک ایکسپریس سے روانہ ہورہے تھے۔ دیگر متعدد حضرات کے ساتھ یہ راقم الحروف بھی حضرت والا کو سفر پر روانہ کرنے کے لئے اسٹیشن پر حاضر تھا۔ حضرت والا اپنے رفقائے سفر کے ساتھ جب ٹرین میں سوار ہوکر اپنی رزرو برتھ پر بیٹھ گئے تو حسب معمول ہم مشتاقان زیارت وطالبان دعا ونصیحت کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ

دیکھئے اس دنیا میں ہر مسافر کو اپنے سفر میں تین چیزیں مطلوب ہوتی ہیں (۱) سفر راحت کے ساتھ ہو ــــ اسی لئے ہم نے اس آرام دہ ڈبے میں رزرویشن کرایا ہے، تاکہ بھیڑ بھاڑ سے

آرام ملے اور معمولات میں خلل نہ ہو۔ (۲) سفر عزت کے ساتھ ہو ــــ اسی لئے ہم نے باقاعدہ رقم خرچ کرکے ریلوے کا اجازت نامہ ریزروٹکٹ کی صورت میں حاصل کیا ہے، تاکہ راستے میں چیکنگ کرنے والوں کے ہاتھوں رسوا نہ ہونا پڑے۔ (۳) سفر عجلت کے ساتھ ہو، کیوں کہ سفر کتنا ہی آرام دہ ہو، مسافر جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے بے قرار رہتا ہے ــــ اسی لئے ہم نے یہاں سے ممبئی جانے والی سب سے تیز رفتار ٹرین کا انتخاب کیا ہے، تاکہ ممکنہ عجلت کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچا جاسکے۔

اس دنیا میں آنے والا ہر شخص بھی مسافر ہے اور اس کی منزل آخرت ہے۔ زندگی کے اس لمبے سفر میں بھی وہی تین چیزیں مطلوب ہیں کہ سفر راحت کے ساتھ ہو، عزت کے ساتھ ہو، اور عجلت کے ساتھ ہو ــــ اس سفر کا بھی ایک ''ریزرویشن ٹکٹ'' ہوتا ہے، جس کے ذریعہ یہ تینوں مطلوبہ چیزیں یقینی طور پر حاصل کی جاسکتی ہیں ــــ اور وہ ٹکٹ ہے ''اتباع سنت''!

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی، اور اپنے وفادار غلاموں صحابہ کرامؓ سے بھی عمل کراکے دکھادیا کہ اس دنیا کی زندگی کا سفر کیسے کیا جائے کہ آخرت کی دائمی ومستقل زندگی میں سرخ روئی حاصل کی جاسکے؟ ــــ پس ہمارے اس سفر دنیا میں ''توشۂ آخرت'' اور ضروری ''سامان سفر'' اتباع سنت ہے۔ جو آسان بھی ہے، اور منزل تک بخیر پہنچنے کی ضمانت بھی۔

حق تعالیٰ کامیابی وکامرانی کی اس ''شاہ کلید'' کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)